ISSN 2321-4627

مئی 2022ء

-/15 روپے

ماہنامہ

قومی زبان

حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و تہذیبی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

داغ دہلوی

تاریخ پیدائش: ۲۵رمئی ۱۸۳۱ء

میراجی

تاریخ پیدائش: ۲۵رمئی ۱۹۱۲ء

www.urduacademyts.com

جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ عزت مآب وزیراعلیٰ تلنگانہ سکریٹریٹ کے تعمیری کاموں کا معائنہ کرتے ہوئے۔
تصویر میں معزز وزراء واعلیٰ عہدیداران دیکھے جاسکتے ہیں

جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ عزت مآب وزیراعلیٰ حکومت تلنگانہ دعوت افطار کے
موقع پر بچوں میں رمضان کے تحائف پیش کرتے ہوئے

www.urduacademyts.com

قرینہ

ہم کلامی	شاہ نواز قاسم' آئی پی ایس	4

یادرفتگاں

داغؔ دہلوی کی فطرت اور جمالیات پسند شاعری	پروفیسر مجید بیدار	5
کلام داغؔ میں ٹکسالی زبان اور محاوروں کا التزام وانضمام	ڈاکٹر محمد اکمل خان	11
میراجی کے احوال وآثار	ڈاکٹر جعفر جری	18

مضامین

ڈاکٹر یوسف حسین خان	پروفیسر مسعود حسین خان	23
رباعی کے فن کو آب وتاب عطا کرنے والا شاعر: علقمہ شبلی	ڈاکٹر مقبول احمد مقبول	29
قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو شاعری کا حصّہ	ڈاکٹر محمد راغب محمد طالب دیشمکھ	33
ج۔ پی سعیدؔ کی شاعری کا فنی تجزیہ	ڈاکٹر محمد انور الدین	38
پریم چند کے خطوط' ادب اور زندگی کی تعبیر	ڈاکٹر الطاف حسین نقشبندی	43
ساحر لدھیانوی	شبنم شمشاد	48
رومان، احتجاج اور محبت کی تثلیث کا غزل گو شاعر		
حفیظؔ جالندھری کی غزلوں میں تلمیحات کا مطالعہ	گلزار احمد ماگرے	52
پریم ناتھ در کے افسانوں میں کشمیر	سنیل کمار	57
رشید احمد صدیقی سلیمان اطہر جاوید کی نظر میں	سردار خواجہ معین الدین (سردار ساحلؔ)	62

تعلیم وروزگار

اساتذہ - تبدیلی کے علم بردار	ڈاکٹر مصباح انظر	68

افسانے

بے کسی حد سے جب گذر جائے	ثریا جبین	73
ساس کو زہر دینے کا طریقہ	ذیشان احمد	79

حصہ نظم

غزلیں	پروفیسر فاروق بخشی / محمد نورالدین امیر	81
نظم عید مبارک / مزاحیہ غزل	اقبال شانہ / ٹپیکل جگتیالی	82

oOo

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی' ادبی' سماجی' تہذیبی و ثقافتی ترجمان

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد: 07 شمارہ: 05 مئی 2022ء

ایڈیٹر

شاہ نواز قاسم' آئی پی ایس

ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

چوتھی منزل' حج ہاؤز' نامپلی

حیدرآباد-001 500 (تلنگانہ)

مقام اشاعت: تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب وتزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ' ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپئے سالانہ -/150 روپئے

Total Pages : 84

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک' ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Shah Nawaz Qasim and published by Shah Nawaz Qasim on behalf of Telangana State Urdu Academy Minorities Welfare Dept., Government of Telangana.
Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

www.urduacademyts.com

ہم کلامی

ماہ مئی 2022ء کے شمارے کی ابتداء حسب معمول ''یادرفتگاں'' سے کی گئی ہے جس میں نظام ششم نواب میر محبوب علی خان بہادر اور عظیم المرتبت شاعر علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے استاذ حضرت داغؔ دہلوی اور بیسویں صدی کے ایک ممتاز اَدیب، شاعر، محقق، نقاد اور صحافی میر اجؔی پر ممتاز اساتذہ و اسکالرس کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں' ان کے علاوہ دیگر تحقیقی مضامین' افسانے اور آخر میں ممتاز شعرائے کرام کے ادبی و مزاحیہ فن پارے شائع کئے گئے ہیں۔ امید کہ یہ نگارشات قارئین اور محبان اردو کی معلومات اور ان کی دلچسپیوں میں اضافہ کا باعث بنیں گی۔

قارئین' انسانی زندگی میں جہاں دیگر ضروریات ہوتی ہیں وہیں زبان کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ دنیا میں ہر قوم کی الگ الگ زبانیں ہیں' مختلف بولیاں ہیں۔ لسانی تحقیق کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً 7000 زبانیں بولی جاتی ہیں' ان میں بہت ساری زبانیں صرف بولی جاتی ہیں' ان کا کوئی رسم الخط نہیں ہے اور ایک اندازے کے مطابق دنیا کی تقریباً چالیس فیصد آبادی کو اس زبان میں تعلیم تک رسائی نہیں ہے جسے وہ بولتے یا سمجھتے ہیں۔ کئی زبانیں معدوم ہورہی ہیں جس کی وجہ سے ان کی اپنی ثقافت اور فکری ورثہ بھی ختم ہورہا ہے۔ آج یہی حال ہماری اپنی مادری زبان اردو کا بھی ہورہا ہے کہ یہ زبان خود اپنی نئی نسل کی بے اعتنائی کا شکار ہورہی ہے۔ طلبہ کے والدین اور سرپرست اپنے بچوں کو دوسری زبانوں میں تعلیم دلوا رہے ہیں۔ ان کی نظر اپنے ثقافتی ورثہ' اپنی تہذیب کی بقا کے لئے اپنی مادری زبان کے تحفظ سے ہٹ کر روزگار اور مسابقت کی طرف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسری زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے سے روزگار کے زیادہ مواقع ہیں' لیکن اس وجہ سے اپنے تشخص' تہذیب اور ورثہ کی امین زبان کو ترک کردینا' اس سے بے رغبتی برتنا اپنی کوتاہی ہوگی۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی مادری زبان کی حفاظت اور اس زبان کی بقا کے لئے دوسری زبانوں کے ساتھ اپنی نئی نسل کو اردو زبان بھی سکھائیں اور پڑھائیں۔ بین الاقوامی تعلیمی ادارہ یونیسکو اسکول کی تعلیم کے ابتدائی سالوں سے ہی مادری زبان پر مبنی کثیر لسانی تعلیم کے لیے رہنمائی اور وکالت کرتا ہے۔ اس روشنی میں دیگر زبانوں کے ساتھ اپنے بچوں کو اردو میں بحیثیت دوسری زبان کے تعلیم دلوا کر کثیر لسانی عمل کو جاری رکھا جاسکتا ہے۔

حکومت تلنگانہ اردو زبان کی ترقی' فروغ اور تحفظ کے سلسلہ میں سنجیدہ ہے' اس خصوص میں قیام تلنگانہ اور نئے 33 اضلاع کی تشکیل کے ساتھ ہی ریاست بھر میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے اور دفتری کاموں میں اس زبان کی شمولیت کی خاطر اردو افسروں کی تقرری عمل میں لائی گئی اور اقلیتی اقامتی مدارس میں اردو بحیثیت دوسری زبان تعلیم کا اہتمام کیا گیا' اسی طرح اردو اکیڈیمی کے ذریعہ فروغ اردو کی کئی اسکیمات پر عمل آوری جاری ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اردو زبان کے تعلق سے حکومت کی دی ہوئی مراعات سے فائدہ اٹھائیں اور اس زبان کی ترقی و ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں' اپنے بچوں کو اس زبان سے واقف کروائیں تاکہ ہمارے تہذیبی ورثہ کی حفاظت ہوسکے اور یہ زبان خوب پھولے پھلے۔

شاہ نواز

شاہ نواز قاسم' آئی پی ایس

ایڈیٹر

www.urduacademyts.com

پروفیسر مجید بیدار
سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

داغ دہلوی کی فطرت اور جمالیات پسند شاعری

دکن کی سرزمین میں قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کی حکمرانی کا سلسلہ شروع ہوا اور جب 1707ء میں اورنگ زیب کا احمد نگر میں انتقال ہوا تو ان کی وصیت کے مطابق ''روضہ خورد'' میں تدفین عمل میں آئی۔ اس علاقہ میں اورنگ زیب کی تدفین کی وجہ سے اورنگ زیب کے لقب یعنی ''خلد مکانی'' کی مناسبت سے اس علاقہ کا نام ''خلد آباد'' رکھا گیا، جو اورنگ آباد سے 24 کلومیٹر کے فاصلہ پر ''روح افزاء'' کے مقام کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے۔ جہاں آصف جاہی بادشاہوں نے باضابطہ سرمائی محل بنا کر اس علاقہ کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ دکن کے بہت بڑے علاقہ پر اورنگ زیب کا قبضہ رہا اور اس کے انتقال کے بعد 1724ء میں شہر اورنگ آباد کو دارالسلطنت کا درجہ دے کر میر قمر الدین علی خاں نے ''آصف جاہی سلطنت'' کی بنیاد رکھی، چنانچہ ملک عنبر کے تعمیر کردہ ''نوکھنڈہ محل'' میں ان کی تاج پوشی کی رسم انجام دی گئی۔ غرض دوسرے آصف جاہی حکمران میر نظام علی خاں نے آصف جاہی سلطنت کے مرکز کو اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کردیا، چنانچہ 1771ء کے بعد سے آصف جاہی سلطنت کا صدر مقام حیدرآباد قرار پایا، جس کے بعد یکے بعد دیگرے مختلف آصف جاہی بادشاہوں نے حکمرانی کی، جس کی وجہ سے حیدرآباد کی سرزمین کو گل وگلزار کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ دکنی باشندوں کے علاوہ شہر حیدرآباد میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے باشندے آکر بسنے لگے، جس کی وجہ سے چھٹویں آصف جاہی فرمانروا نواب میر محبوب علی خاں کے دور سے ہی حیدرآباد کو کاسموپولیٹن شہر کا درجہ حاصل ہوگیا۔ دہلی، لکھنؤ اور فیض آباد ہی نہیں، بلکہ امروہہ اور مدراس کے علاقہ سے ممتاز عالم دین، شاعر اور ادیب کے علاوہ ماہرین فن اس سرزمین کی طرف رخ کرنے لگے۔ ایسے ہی اہم شاعروں اور اردو غزل کے فنکاروں میں نواب مرزا خان داغ کا شمار ہوتا ہے، جو دہلی سلطنت کے مغلیہ آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور شاعری میں اس قدر کمال حاصل کرلیا تھا کہ یوروپ کی سرزمین میں جس طرح گرم کیک کو اہمیت حاصل ہوئی ہے، اسی طرح ہندوستان کی سرزمین میں شعر وادب کے توسط سے داغ دہلوی اگر رات میں غزل لکھتے تو ان کی غزل صبح کو ہندوستان بھر میں مختلف محفلوں میں پیش کرنے کا وسیلہ بن جاتی تھی۔ حتیٰ کہ کوٹھوں پر ان کی غزلوں کو شہرت ملی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے غزل کی شاعری میں انفرادیت کا مقام حاصل کرتے ہوئے یہ شعر لکھ دیا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغ کی شاعری کو ان کے وطن اور ملک دکن میں

www.urduacademyts.com

اعتبار کا درجہ حاصل ہوا اور ہر نقاد اور محقق نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ غزل کے جمالیاتی احساس کے شاعر تھے، جس کے ذریعہ حسن و عشق کی واردات اور دلی صدمات کے علاوہ بے بسی اور مجبوری کو شعری اظہار کا ذریعہ بنانا ان کے فن کا کمال تھا، لیکن غزل کی شاعری میں داغؔ دہلوی نے اپنی شعری انفرادیت اور غزل کی معنویت کے ساتھ ساتھ فکر کی بالیدگی کو بھی نمائندگی دی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملاتِ عشق بیان کرنے کے ساتھ ساتھ داغؔ دہلوی نے جاگیردارانہ مزاج کی طرف بھی توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کے چار دیوانوں میں اِس قسم کا شعر بھی اہمیت کا حامل ہوجاتا ہے:

نہیں داغؔ آسان یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

داغؔ کی تمام تر شاعری جمالیاتی احساس کا بے مثال نمونہ ہے، انہوں نے غزل کی شاعری میں نفاست اور نزاکت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی حقیقت کی جلوہ گری کو بھی پیش نظر رکھا۔ یہی وجہ رہی کہ ان کا ہر شعر دل میں اترنے کے ساتھ ساتھ اثر کی تمام طاقتوں کو واضح کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ محبوب اور اس کے حسن ہی نہیں سراپا اور اس کی ایک ایک روش پر تعریف و توصیف کا رویہ اختیار کرنا داغؔ دہلوی کی غزل کی خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تعریف و توصیف کے لئے بھی ایسا رویہ اختیار کیا کہ جس میں جمالیاتی حس کی شدت محسوس کی جاسکتی ہے۔ حسن اور اس کی جلوہ نمائیوں سے آگاہی دینے کے لئے بلاشبہ داغؔ کے اشعار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تعریف کے دوران بھی وہ حسن نسوانی کو اجاگر کرنے میں اس قدر منہمک رہے ہیں کہ حسن و نزاکت اور محبوب کی ہر روش کی تعریف کے دوران بھی اس انداز کے شعر ان کی جمالیاتی حقیقت پسندی کی دلیل بن جاتے ہیں:

خط ان کا بہت خوب، عبارت بہت اچھی
اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ

طرزِ تحریر کی تعریف کے لئے بھی داغؔ دہلوی نے نسوانی حسن کی خصوصیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ اپنے دور کے نابغۂ روزگار شاعر تھے، جن کی غزلوں اور قصیدوں نے ہی نہیں، بلکہ برجستہ گوئی بھی اردو دنیا میں یادگار کا درجہ رکھتی ہے۔ دہلی کی سرزمین میں 25 مئی 1831ء کو پیدا ہونے والے نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی کا تعلق مغلیہ خاندان کے شاہی گھرانے سے تھا، جبکہ ان کی والدہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ طوائف کی زندگی گذارتے ہوئے کئی امراء کی خاتون خانہ بننے کے بعد مغلیہ شہزادے کی اہلیہ کی حیثیت سے شہرت کی حامل ہوگئیں۔ شہزادوں کی طرح زندگی گذارنے کے باوجود بھی 1857ء کے غدر کے بعد مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمایا اور انگریز اقتدار غالب ہوگیا، تو اس وقت ان کی عمر بہ مشکل 26 سال تھی۔ شاہانہ پرورش اور شہزادوں کے شوق پورے کرنے کے مواقع حاصل رہے، جب دہلی کے تخت سے ان کے آبا و اجداد کو بے دخل کردیا گیا تو وہ روٹی روزی کے لئے پریشان رہے، لیکن ان کی شاعری اور ادب دوستی کو

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

اہمیت دیتے ہوئے نوابانِ رام پور نے سرپرستی کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ وہ دہلی سے منتقل ہوکر رام پور کے شاہوں کے دربار سے وابستہ رہے، جب رام پور کے دربار پر تباہی کے بادل چھانے لگے،توانہوں نے دربارِحیدرآباد کا رخ کیا۔اس وقت چھٹویں آصف جاہی نظام میر نواب محبوب علی خاں کی حکمرانی تھی، جنہوں نے اپنی ریاست کی سرکاری زبان اردو قرار دی تھی اور اردو کی سرپرستی کے لئے ریاستِ حیدرآباد میں سرکاری اقدامات کا سلسلہ جاری تھا،جس سے متاثر ہوکر نواب مرزا خان داغؔ نے حیدرآباد کا رخ کیا۔حیدرآباد کے باشندوں اور امیر و امراء کے علاوہ شاہی دربار میں ان کو کافی دسترس حاصل ہوگئی۔حتیٰ کہ نواب میر محبوب علی خاں کو جب تاجِ برطانیہ کی طرف سے دہلی میں جوبلی منانے کے دوران مدعو کیا گیا تو بادشاہِ وقت کے ساتھ داغؔ دہلوی بھی دہلی کے سفر میں شریک رہے۔ لازمی ہے کہ داغؔ جیسے شاعر سے اصلاح لینے والے لاکھوں شعراء ہندوستان کے مختلف خطوں میں آباد تھے، داغؔ کے دہلی پہنچنے کے موقع پر ان کے شاگرد بیخود دہلوی نے اپنی اعلیٰ ظرفی اور شگفتہ مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مضمون میں بطورِ خاص لکھا ہے کہ استادِ محترم کی شاہی مہمانی کے دوران انہیں خدمت کرنے کا موقع حاصل ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ داغؔ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ایک دن انہوں نے چٹھی روانہ کی، جس میں نفسِ مضمون کے علاوہ یہ مصرعہ بھی درج تھا:ـ

نہیں ملتی یہاں ہرنی کبابوں کو ترستے ہیں

بیخود دہلوی نے چٹھی کا مدعا سمجھتے ہوئے استاد کی خدمت کو جاری رکھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغؔ دہلوی کی مئے نوشی کو بھی بڑا وقار حاصل تھا۔بیخود دہلوی نے باضابطہ داغؔ دہلوی کے قصائد کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ جب انہوں نے دربارِ محبوبی میں اپنا قصیدہ پیش کیا اور قصیدہ کے آخری شعر میں حسنِ مدعا ظاہر کیا جو اس طرح تھا:

تم قدح خوار ہوئے شاہِ دکن کے اے داغؔ
اب خدا چاہے تو منصب بھی ہو جاگیر بھی ہو

قصیدہ گوئی کی صنف میں جہاں تشبیب اور گریز سے کام لیا جاتا ہے، وہیں قصیدے کے آخر میں مدعا بھی بیان کیا جاتا ہے۔ اسی طریقے کو اختیار کرتے ہوئے داغؔ دہلوی نے اپنے قصیدہ کے ذریعہ مدعا بیان کیا۔ جس کے نتیجہ میں نواب میر محبوب علی خاں نے انہیں منصب اور جاگیر سے سرفراز فرمایا۔غرض وہ دور ہی ایسا تھا جبکہ شاہانہ سرپرستی میں شاعروں اور ادیبوں کی ہمت افزائی کی جاتی تھی اور ان کی برجستہ گوئی پر شاہانہ انعام و کرام کی بارش بھی ہوتی تھی۔ داغؔ دہلوی بلاشبہ اردو کے چند ایسے ممتاز شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں، جن کی غزلوں کو آج کے دور میں بھی امتیاز کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ مختلف محفلوں میں ہی نہیں، بلکہ گائیکی کے مقابلوں میں بھی داغؔ دہلوی کی غزل کو اہمیت حاصل ہوجاتی ہے۔ حیدرآباد کے دربار سے وابستگی کے بعد داغؔ دہلوی کو بادشاہِ وقت کی جانب سے بے شمار سہولتیں حاصل ہوئیں، جس کی وجہ سے وہ 1857ء کے غدر کی تکالیف سے بے نیاز

www.urduacademyts.com

ہوگئے۔ان کی غزلوں کے بے شمار مجموعے اور انتخابات شائع ہوچکے ہیں۔ اردو کے شاعروں میں داغؔ دہلوی اپنی طویل عمری کی وجہ سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ حیدرآباد کے بادشاہ نواب میر محبوب علی خاں کے دربار سے حاصل ہونے والی سہولتوں کے نتیجہ میں ان کی تمام تر زندگی عیش و آرام میں گذر گئی۔ انہوں نے طبعی عمر کے 73 سال اس دنیا میں گذارے۔ انتقال کے بعد شاہی اعزاز کے ساتھ 17 مارچ 1905ء کو حیدرآباد کی سب سے مشہور درگاہ یوسفینؒ میں تدفین عمل میں آئی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغلیہ شہزادے کی بے عزتی کو ختم کرکے ان کی تعظیم و تکریم کو برقرار رکھنے میں حیدرآباد کے آصف جاہی سلطنت کے بادشاہوں کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ دہلی میں رہتے یا رام پور میں تو انہیں وہ سہولتیں حاصل نہیں ہوتیں، جو حیدرآباد کے آصف جاہی سلطنت کے فرمانروا نے ان کے لئے فراہم کی تھیں۔ ان کی زبان کی برجستگی اور شائستگی کے علاوہ تہذیب اور اخلاق کے دائرے میں لکھی ہوئی غزلیں اردو زبان و ادب میں کارنامے کا درجہ رکھتی ہیں۔ سادہ اور صاف ستھرے لہجہ میں کم سے کم الفاظ کا استعمال کرکے مدعا بیان کرنا داغؔ دہلوی کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ چنانچہ وہ غزل کی شاعری میں میرؔ و غالبؔ کے بعد ایک اہم غزل گو ہندوستانی شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت میں جہاں اردو غزل کی شیرینی کا بہت بڑا حصہ ہے، تو اسی کے ساتھ ہی غزل کی شاعری کو جمالیاتی احساس سے وابستہ کرکے تغزل کی رعنائی اور جذبات کی فراوانی کو داغؔ دہلوی کا امتیازی وصف قرار دیا جاتا ہے۔ بے ساختہ شعری رویے کی وجہ سے وہ غزل کے نامور شاعر کی حیثیت سے شہرت کے حامل ہوئے، لیکن مثنوی اور مرثیہ جیسی شعری اصناف پر توجہ دینے کے بجائے قصیدہ اور قطعہ کے علاوہ رواں نظموں کے ساتھ ساتھ غزل مسلسل کی روایت کو فروغ دے کر داغؔ دہلوی نے اردو کی شاعری میں قیامت تک کے لئے شہرت دوام کے حامل ہوگئے۔ چنانچہ غزل کی شاعری میں بے ساختہ موضوعات اور برجستہ اظہار کا ایسا رویہ داغؔ دہلوی کے کلام کا وصف قرار پاتا ہے، جس کے معیار و مرتبہ کو کوئی دوسرا شاعر ابھی تک اس طرز و انداز کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا۔ بے شمار شاعرانہ صلاحیت کے مالک ہونے کے باجود بھی ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت دور میں بھی ان کا ہم رتبہ شاعر پیدا نہ ہوسکا۔

تاریخ ادب اردو کی بے شمار کتابوں میں داغؔ دہلوی کی شعر گوئی اور ان کی بذلہ سنجی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ کئی رسالوں اور جریدوں کی خصوصی اشاعتوں میں بھی داغؔ نمایاں ہیں۔ موجودہ دور کی تاریخ ادب اردو کے اہم قلمکار پروفیسر سیدہ جعفر نے بھی اپنی کتاب ''تاریخ ادبِ اردو'' (جلد سوم) کے توسط سے داغؔ دہلوی کی شخصیت اور شاعری اور ان کے کارناموں کا احاطہ کیا ہے۔ اس کے باوجود بھی اردو کے سب سے پہلے ''تاریخ ادب اردو'' کے مورخ رام بابو سکسینہ نے جس حقیقت پسندی کے ذریعہ داغؔ دہلوی

www.urduacademyts.com

کی شاعری اور ان کے افکار کی نمائندگی کی ہے، بلاشبہ اس طرزِ عمل کو تحقیق وتنقید کی سچی روش کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے ان کی مشہور کتاب ''تاریخ ادب اردو'' سے داغؔ کی شاعری اور ان کی خدمات کے بارے میں حوالے درج کئے جارہے ہیں۔

داغؔ اپنے زمانہ کے بہت مشہور شاعر تھے۔ ان کی زبان میں فصاحت و سادگی اور بیان میں ایک خاص قسم کی خوشی اور بانکپن ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیرؔ، جلالؔ، تسلیمؔ وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کا طرز عام پسند اور بہت دلچسپ ہے۔ اسی وجہ سے ان کے متبعین کثرت سے ہیں، مشہور ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد پندرہ سو سے تجاوز ہے۔ یہی شہرت وعزت اور شاگردوں کی کثرت ان کے جوہر ذاتی اور شاعرانہ قابلیت پر دال ہے۔ داغؔ نے ایک باضابطہ دفتر کھول دیا تھا، جس کے کارکن بعض ان کے شاگرد اور اکثر تنخواہ دار منشی بھی تھے۔ اس دفتر میں اصلاح کلام کا کام جاری تھا۔

داغؔ کی شاعری کو جس فطری اور تحقیقی وتنقیدی پس منظر میں اجاگر کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ نے حقائق کا اظہار کیا ہے، اس سے خود پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے دور میں غزل گوئی کے ماہر اور غزل کے موضوعات میں حسن وعشق کی کارسازی کو پیش کرنے میں اس قدر آگے بڑھ چکے تھے کہ ان کے عہد یا پھر اس سے قبل کے شعراء بھی داغؔ کی غزل گوئی کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اسی تجزیہ کے بعد رام بابو سکسینہ نے داغؔ دہلوی کی تصنیف وتالیف کے توسط سے نہ صرف ان کی غزل گوئی، مثنوی نگاری، قصیدہ نگاری اور قطعات ورباعیات کے دوران رویہ کا فنی محاکمہ کیا ہے۔ جس سے ان کی متوازن شعری روش کا پتہ چلتا ہے۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

داغؔ کے چار دیوان ان کی یادگار کا درجہ رکھتے ہیں۔ گلزار داغؔ، آفتابِ داغؔ، مہتاب داغؔ، یادگارِ داغؔ۔ آخر الذکر یعنی ''یادگارِ داغؔ'' کا ایک ضمیمہ بھی ہے اور یہ ضمیمہ اور اصل دیوان دونوں ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے تھے۔ ایک مثنوی موسوم بہ ''فریاد داغؔ'' بھی لکھی ہے، ان کے علاوہ چند قصائد حضور نظام اور نواب صاحب رام پور کی تعریف میں موجود ہیں، ایک پرجوش ''شہر آشوب'' دلی کی تباہی پر اور چند قطعات ورباعیات بھی ان سے یادگار ہیں۔ ''گلزار داغؔ'' اور ''آفتاب داغ'' دونوں رام پور میں چھپے تھے اور ان میں زیادہ تر وہ غزلیں ہیں جو رام پور کے مشاعروں میں امیر مینائی اور تسلیم وجلال وغیرہ کی ہم طرح میں کہی گئی ہیں۔ اس زمانے کے کلام میں ان کی بے انتہاء مشاقی اور بڑی محنت و جانفشانی معلوم ہوتی ہے۔ ''مہتاب داغؔ'' اور ''یادگارِ داغؔ'' دکھن کی تصنیف ہیں، ان میں بھی کلام کی روانی اور فصاحت جیسا ان کا خاص انداز ہے، خاص طور قابل تعریف ہے۔ ''گلزار داغؔ'' جوانی کی تصنیف ہے۔ جب جذباتِ عشق ومحبت محض خیالی نہ تھے، بلکہ ذاتی تجربہ کا آئینہ تھے۔ ''آفتاب داغؔ'' بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے، جس میں واردات قلبیہ اور جذبات حقیقی کی اصلی تصویریں شاندار

www.urduacademyts.com

الفاظ میں کھینچی گئی ہیں۔مگر برخلاف ان کے ''مہتاب داغؔ'' اس زمانہ کی تصنیف ہے، جبکہ حرارتِ عشق و جوانی دھیمی اور ہلکی ہوکر ضیائے ماہتاب کے مانند نہایت خوشگوار ہوگئی ہے اور شباب کی ولولہ انگیزیاں اور ہنگامہ آرائیاں رخصت ہوکران کی جگہ کہولت کی پختہ کاری اور سکون واطمینان نے لے لی ہے۔

داغؔ کے چاروں دواوین کی شاعری پر تبصرہ پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ راما بابو سکسینہ نے داغؔ کی مثنوی، قصائد، قطعات اور رباعیات کے علاوہ قطعاتِ تاریخ پر انتہائی عالمانہ جائزہ پیش کیا ہے۔اس لئے ''تاریخ اردو ادب'' جیسی کتاب کے رام بابو سکسینہ کا تحریر کردہ اقتباس درج ہے۔

مثنوی ''فریادِ داغؔ'' میں اپنے عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور طوائف منی بائی حجاب کے ساتھ ان کو تھا اور جو رام پور کا میلہ بے نظیر دیکھنے کی غرض سے آئی تھی، ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔اس مثنوی کے بہت سے اشعار نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں اور سادگی اور روانی و عمدگی ان کی قابل داد ہے۔علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔ قصائد میں ان کا مرتبہ بہت کم ہے، یعنی سوداؔ اور ذوقؔ وغیرہ سے تو کوئی نسبت ہی نہیں، ہمارے نزدیک امیر مینائی کے قصائد کو بھی وہ نہیں پہنچتے ، ان میں کسی طرح کے بلند مضامین اور اعلیٰ تخیل نہیں ہے۔غزل گوئی کا رنگ ان پر غالب ہے اور اکثر اشعار قصیدے کے نہیں، بلکہ غزل کے معلوم ہوتے ہیں اور مقررہ قواعدِ قصیدہ گوئی کے منافی ہیں۔تشبیہ و استعارے میں بھی کسی قسم کی جدت نہیں پائی جاتی اور ان میں بھی وہی عاشقانہ رنگ جھلکتا ہے۔ان کی رباعیات کا بھی یہی حال ہے، یعنی بجائے ادب واخلاق وغیرہ سکھانے کے ان کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہی ہیں۔ البتہ تاریخیں بہت اچھی اور استادانہ کہی ہیں۔

بلاشبہ داغؔ دہلوی کے عاشقانہ خیالات کا غلبہ ان کے قصیدوں اور رباعیات کو فنی خصوصیات سے دور کردیتا ہے، البتہ انہوں نے اپنے دور کے اساتذہ اور اہم مصنفین کی کتابوں پر اشعار کے ذریعہ جس قسم کے تاریخی قطعات لکھے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغؔ دہلوی کو شاعری میں تاریخ نویسی کے فن پر عبور کا ثبوت ملتا ہے۔ داغؔ کے لکھے ہوئے قصائد میں اس دور کی روایت یعنی ''سہرا نویسی'' کی روایت دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ ان کی شاعری میں ''شہر آشوب'' کی خصوصیت بھی دہلی کی خستہ حالی کی دلیل ہے۔غرض شاعری کے مختلف انداز میں اظہار خیال کرتے ہوئے داغؔ دہلوی کا کمال یہی رہا کہ انہوں نے مرثیہ اور ریختی لکھنے سے پرہیز برتا، لیکن غزل گوئی میں وہ مقام حاصل کرلیا کہ بلاشبہ میرؔ و غالبؔ کے بعد غزل کی شاعری میں داغؔ دہلوی کے نام کو پورے اعتبار کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر مجید بیدار
سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

www.urduacademyts.com

کلام داغؔ میں ٹکسالی زبان اور محاوروں کا التزام وانضمام

نواب مرزا خان داغؔ دہلوی ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔کم سنی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔بچپن قلعہ معلیٰ میں شہزادے اور شہزادیوں کے ساتھ گزرا اور وہیں انہوں نے قلعے کی محاوراتی اور روزمرہ کی زبان سیکھی۔ قلعے میں شعروسخن کا ماحول تھا۔ بہادر شاہ ظفر خود شاعر تھے۔ غالبؔ، مومنؔ اور شیفتہؔ جیسے استاد شعرا کا قلعے میں آنا جانا تھا، ایسے میں داغؔ ان سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔داغؔ نے کم عمری سے مشق کلام شروع کی اور ذوقؔ کو اپنا استاد اور رہنما بنایا۔غدر کے بعد رامپور کو اپنا مسکن بنایا جہاں امیرؔ مینائی، ظہیرؔ دہلوی اور مرزا غالبؔ کی صحبت میں رنگ سخن دوبالا ہوتا گیا اور اس طرح اردو شاعری کا ایک نیا دبستان وجود میں آیا۔۱۸۸۸ء میں رامپور سے حیدرآباد گئے اور وہاں میر محبوب علی خاں کے دربار سے وابستہ ہوئے اور ان کے استاد بھی بنے۔زندگی کے باقی ایام سرزمین حیدرآباد سے ان کی وابستگی کے ضامن ہیں، جہاں وہ ۱۹۰۵ء میں اس جہان فانی کو خیرباد کہہ کر سپرد خاک ہوئے۔

داغؔ کے کلام میں غزل کے ساتھ ساتھ قصائد، مثنوی، شہر آشوب، تضمین، قطعات (تاریخی و غیر تاریخی)، رباعیات، سلام اور سہرے بھی موجود ہیں لیکن ان کی تمام تر شہرت غزل کی بدولت ہے۔غزل کے معاملے میں داغؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو حزنیہ ماحول سے نکال کر نشاطیہ لب ولہجہ عطا کیا۔ان کے یہاں شوخی بھی ہے، طنز بھی ہے، محاکاتی انداز بھی ہے، ترنم، سلاست اور روانی ہے اور سادگی و پرکاری بھی ہے۔روزمرہ کی زبان بھی ہے اور برمحل محاوروں کا خوبصورت استعمال بھی ہے اور وہ مردانہ لب ولہجہ بھی ہے جس کے وہ موجد بھی ہیں اور کسی حد تک خاتم بھی۔غزل میں ان کی زبان کو جو مقام حاصل ہے وہ اردو کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا۔

اچھی غزل کی تخلیق کے لیے زبان پر قدرت اور الفاظ کے انتخاب پر مہارت ہونا بہت ضروری ہے۔اس لیے ہر بڑا شاعر اپنی غزلوں میں ایسے علامتی الفاظ کا استعمال کرتا ہے جس میں وجدان کو متاثر کرنے کی پوری صلاحیت اور محاکات کی باز آفرینی کی پوری قدرت ہو۔یہی سبب ہے کہ داغؔ نے اپنی غزلوں کو علامتی الفاظ اور محاکات کی باز آفرینیوں سے مرصع کیا اور اس لیے ان کی غزلوں میں رمزی اور ایمائی کیفیت، بے ساختگی، حسن بندش، لطیف محاورہ، روزمرہ، بے تکلفی اور حسن وعشق کی کیفیات کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔

داغؔ سے پہلے شاہ نصیر نے بھی اردو غزلوں میں نئی نئی تشبیہات واستعارات، مضمون آفرینی اور محاکات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے شاہ نصیر کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاہ نصیر سنگلاخ زمینوں میں نئے نئے تشبیہ اور استعاروں سے مضمون آفرینی کا گلزار کھلاتے ہیں۔ساتھ ہی محاورے کا بھی خیال رکھتے ہیں لیکن ان کا گلزار کہیں کہیں

www.urduacademyts.com

رنگین تو ہے لیکن خوشبو کہیں نہیں۔ان کے تشبیہ و استعارے جن پران کو بہت ناز تھا بعض اوقات دور از کار ہو جاتے ہیں۔''
(ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔''دلی کا دبستان شاعری''۔انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔۱۹۴۹ء۔ص ۹۵)

داغؔ کی زبان کو لافانی بنانے میں دو باتیں بہت اہم ہیں۔ایک تو استاد ذوقؔ کی شاگردی اور دوسری قلعہ معلّٰی میں داغؔ کی پرورش۔ذوقؔ کو اردو قصیدہ نگاری میں امام کا درجہ حاصل ہے۔اس کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف سخن میں بھی انہیں کافی دسترس تھی۔ذوقؔ کو زبان و بیان پر زبردست قدرت حاصل تھی۔انہوں نے روزمرہ اور محاوروں کے ساتھ ساتھ تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیا،جس کی تصدیق ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے یہاں سے بھی ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں:

''ذوقؔ کے یہاں زبان کا چٹخارا، محاورے اور روزمرے کی صفائی خوف ہے۔خیال آفرینی،مضمون آفرینی اور تشبیہوں اور استعاروں میں جدت یہ بھی کرتے ہیں لیکن جہاں بعید از فہم ہو جاتے ہیں بالکل ناسخ ہو جاتے ہیں۔''
(ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔''دلی کا دبستان شاعری''۔انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔۱۹۴۹ء۔ص ۹۵-۹۶)

ناسخؔ بھی ذوقؔ کی عظمت کے قائل تھے۔ان کے نزدیک ذوقؔ جیسا صاحب قدرت شاعر اردو میں دوسرا کوئی نہیں۔داغؔ استاد ذوقؔ جیسے قادر الکلام اور تمام اصناف سخن پر مہارت رکھنے والے شاعر کے زیر سایہ پروان چڑھے۔زبان کی صفائی اور روزمرہ اور محاوروں کا برمحل استعمال داغؔ کو ذوقؔ ہی کی بدولت نصیب ہوا۔

داغؔ سنہ ۱۸۷۷ء میں لال قلعے میں پہنچے اور سنہ ۱۸۵۶ء کو انہیں قلعہ معلّٰی کو خیر باد کہنا پڑا۔داغؔ نے زندگی کے بارہ سال قلعہ معلّٰی میں شہزادوں کے ساتھ گزارے جہاں دلی کی ٹکسالی زبان بولی جاتی تھی۔سیدھی سادی اور بامحاورہ زبان داغؔ کو قلعہ معلّٰی ہی سے ملی۔ڈاکٹر اعجاز حسین نے لکھا ہے:

''داغؔ کی ابتدائی نشو و نما دہلی میں ہوئی،قلعہ معلّٰی میں رہے جہاں ٹکسالی زبان کا سکہ رائج تھا سیدھی سادی زبان اور سلجھا ہوا بیان عام طور سے مرغوب خاطر تھا۔استاد ذوقؔ کی رہنمائی میں داغؔ کو اسی زبان و بیان کا سامنا کرنا پڑا۔''
(پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین۔''داغؔ ترجمان رہنمائے اردو''۔نگار۔''داغؔ نمبر''۔لکھنؤ،جنوری فروری۔سنہ ۱۹۵۳ء۔ص ۱۹)

داغؔ نے پوری زندگی اردو زبان کی خدمت میں صرف کی۔انہوں نے زبان کی صفائی،اس کی سادگی،روزمرہ اور محاورے کے استعمال پر پوری توجہ رکھی۔وہ اردو کو اپنی زبان کے علاوہ کسی غیر کی زبان ماننے کو تیار نہیں تھے۔ان کا کہنا تھا کہ:

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغؔ
اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں

داغؔ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ دہلی کی شائستہ اور شستہ زبان پورے ہندوستان میں پھیل جائے۔اور زندگی کے آخری لمحہ تک ان کی یہ کوشش جاتی رہی۔

داغؔ نے متعدد خطوط میں اپنے شاگردوں کو زبان کے سلسلے میں اہل دہلی کی تقلید کرنے کا مشورہ دیا ہے۔کیونکہ داغؔ کے نزدیک صرف اہل دہلی اور اس کے قرب و جوار کے

www.urduacademyts.com

لوگوں کی زبان ہی مستند تھی۔

احسن مارہروی کی درخواست پر داغ نے ایک قطعہ اپنے شاگردوں کے لیے بطور ہدایت نامے کے تحریر کیا تھا جو"یادگار داغ" میں شامل ہے۔اس میں داغ نے شعر کے محاسن کے لیے ضروری باتوں کو استعمال کرنے اور شعر کے عیب کے لیے بعض غیر اہم باتوں کو ترک کرنے کی ہدایت کے ساتھ دہلی کی مستند زبان کا بھی ذکر کیا ہے۔مثلاً:

مستند اہل زباں خاص ہیں دہلی والے
اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا

داغ نے اردو زبان کو عام فہم بنانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے اور اس سب سے ان کی شاعری میں سلاست اور روانی کے دریا بہتے نظر آتے ہیں۔انہوں نے ہمیشہ اپنے اشعار میں فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب سے اجتناب کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں فارسیت کی جھلک ان کے دور کے دوسرے شعرا کے مقابلے بہت کم پائی جاتی ہے۔وہ تو اس کے قائل تھے:

کہتے ہیں اسے زبان اردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

اور اپنے اس اصول پر داغ زندگی بھر عمل پیرا رہے۔سادگی اور سلاست کی بنیاد جن باتوں پر ہے ان میں مشکل اور نامانوس الفاظ سے اجتناب اور ان کی جگہ ایسے الفاظ کا استعمال جو سہل ہوں، جن کی آواز سے گوش آشنا اور انسان مانوس ہو اور انسان کی پہنچ سے بالاتر نہ ہو۔اسی خوبی کو شاعری میں سلاست کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔داغ کی شاعری میں یہ خوبی قدم قدم پر پائی جاتی ہے۔داغ نے مشکل سے مشکل مضامین کو سیدھے سادے الفاظ میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ وہ سہل ممتنع کی مثال ہو کر رہ گئے ہیں۔اس کی تصدیق رام بابو سکسینہ سے بھی ہوتی ہے:

"انہوں نے سخت اور مغلق الفاظ ترک کر کے سیدھے سادھے اور شیریں الفاظ اور محاورے اپنے کلام میں استعمال کیے جس سے کلام کی بے ساختگی اور فصاحت اور بڑھ گئی۔"[۴]

(ڈاکٹر رام بابو سکسینہ۔"تاریخ ادب اردو"۔ بزم خضر راہ۔ دہلی۔۲۰۰۰ء۔ص ۳۲۸)

داغ کے یہ چند اشعار اس خوبی سے مالا مال ہیں:

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ کے سر کی قسم داغ کا حال اچھا ہے
داغ کہتے ہیں جسے دیکھیے وہ بیٹھے ہیں
آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے

داغ کے کلام میں اسی قسم کے اشعار کا بہت بڑا سرمایہ موجود ہے جن میں نہ صرف سلاست، روانی اور سادگی ہے بلکہ ان میں ایک طرح کی پرکاری بھی ہے۔اور اس پرکاری نے داغ کو اردو کے دوسرے شاعروں سے ممتاز بنا دیا ہے۔

داغ کی شاعری میں محاکات کا طلسم بھی جا بجا بکھرا ہوا ہے۔اسی سے وہ قاری کو بہت جلد سحر زدہ کر دیتے ہیں۔داغ کو موزوں اور مناسب الفاظ کے استعمال پر اسی قدر قدرت حاصل تھی کہ وہ ان الفاظ سے محاکاتی تصویریں کھینچنے میں ملکہ رکھتے تھے۔شعر پڑھتے جائیے ایسا محسوس ہوگا کہ

www.urduacademyts.com

سب کچھ نظروں کے سامنے ہو رہا ہے۔مندرجہ ذیل اشعار میں داغ نے الفاظ کے ذریعے منظر کشی کی ہے:

زلف برہم عرق آلودہ جبیں، دامن چاک
کس کے آغوش سے تو جان چھڑا کر نکلا
خمار آلودہ آنکھیں، بل جبیں پر، درد ہے سر میں
رہے تم رات بھر بے چین کس کمبخت کے گھر میں

داغ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اشعار میں الفاظ کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ شعر میں مکالمے کا لطف پیدا ہو جاتا ہے اوراس میں زبان کی فصاحت طبیعت کی شوخی اور بے تکلفی پھر بھی برقرار رہتی ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار مکالمے کے لطف سے معمور ہیں:

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائیے قسمیں
مجھے یقین ہوا مجھ کو اعتبار آیا
جاؤ تم کیا کروگے مہر و وفا
بارہا آزما کے دیکھ لیا

داغ کی زبان میں جہاں اور بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں وہیں روزمرہ کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔شاعر کو جب تک اس پر پوری قدرت نہ ہووہ روزمرہ کا استعمال مناسب طریقے پرنہیں کرسکتا۔داغ کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قلعہ معلیٰ کے ساتھ ساتھ دہلی کی بولی ٹھولی اور جامع مسجد کے شہروں کی زبان بھی جانتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو روزمرہ کی زبان میں اس طرح ادا کر دیا ہے کہ ان کی شاعری اس سے دوآتشہ ہوگئی ہے۔

داغ کی غزل میں شوخی ہو یا شگفتگی۔آمنے سامنے کی چوٹیں ہوں یا چھیڑ چھاڑ۔جلی کٹی ہو یا طعن وتنبیہ۔شرارت ہو یا چلبلا پن غرض ہر جگہ داغ نے روزمرہ کو قائم رکھا ہے۔مثلاً:

ناروا کہیے نا سزا کہیے
کہیے کہیے مجھے برا کہیے
وہ ملے لب تمہارے وعدے پر
وہ تمہاری زبان سے نکلا
شب وصال ان کا یہ گھبرا کے کہنا
ہاتھ ٹوٹیں جو ہمیں ہاتھ لگائے کوئی
عرض احوال کو گلہ سمجھے
کیا کہا میں نے اور کیا سمجھے

داغ کی زبان کو زندہ وجاوید بنانے میں سب سے اہم کردار ان کی محاورہ بندی کا ہے۔داغ کے کلام میں یوں تو زباں کی صفائی وسادگی فصاحت و بلاغت۔روانی وشگفتگی۔نشاطیہ لب ولہجہ کی انفرادیت۔

بے ساختگی و برجستگی شوخی وطنز سب ہی کچھ موجود ہے لیکن داغ نے برمحل اور دلآویز محاوروں کے استعمال سے اپنی شاعری میں جو بانکپن اور تیور پیدا کیے ہیں اس نے انہیں نہ صرف اپنے دور کے بلکہ تمام اردوغزل گویوں میں ایک ممتاز مقام پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔اس کی تصدیق حامد حسین قادری کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''انتخاب الفاظ، حسن بندش، لطیف محاورہ، صفائی و روانی میں کسی اردو شاعر سے کم نہیں۔اپنے زمانے میں

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

بے نظیر ہیں۔''

(مولانا حامد حسین قادری۔''مقدمہ کمال داغ''۔ص ۱۰۹)

داغ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ دہلی کی ٹکسالی زبان یعنی قلعہ معلیٰ کی زبان کے شستہ الفاظ اور محاوروں کو اپنی شاعری میں نظم کریں اور انہوں نے اس کا اہتمام زندگی کے آخری لمحے تک کیا۔اس لیے پروفیسر شوکت سبزواری نے لکھا ہے:

''داغ نے دہلی کی ٹکسالی زبان استعمال کی جس میں لاکھوں بناؤ کے باوجود ایک طرح کا الہڑ پن ہے۔داغ دہلی کے تھے۔دہلی کی زبان پر مٹے ہوئے تھے۔خود اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے کہ وہ دہلی کے خاص خاص الفاظ و محاورے نظم کر کے ان کو حیات جاوید بخش دیں اور شاگردوں کو بھی ہدایت تھی کہ وہ دہلی کی زبان لکھیں۔''

(پروفیسر شوکت سبزواری۔''داغ کی شخصیت''۔نگار۔''داغ نمبر''۔لکھنؤ۔جنوری فروری۔سنہ ۱۹۵۳ء۔ص ۱۲۸)

داغ نے اپنے کلام میں جتنے محاورات کا استعمال کیا شاید ہی اردو کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں ہو۔داغ کے کل اشعار کی تعداد ۱۴۹۷۵ ہے۔جس میں بقول سید علی زیدی ۴۴۶۴ محاورے داغ نے استعمال کیے ہیں۔اس طرح تقریباً داغ کے ہر تین اشعار میں سے ایک شعر میں محاورہ کا استعمال ہوا ہے۔اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ داغ کو محاورات کا کس قدر شوق تھا۔اور وہ اس فن میں کسی قدر مہارت رکھتے تھے۔داغ نے محاورات کے استعمال میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ محاورے کو اس طرح استعمال ہونا چاہیے جیسے کہ وہ روزمرہ کی گفتگو میں بولے جاتے ہیں۔جن اشعار میں داغ نے محاوروں کا استعمال کیا ہے وہ نہایت دلکش، دل آویز اور زبان کے محاسن سے معمور ہیں۔محاوروں کے استعمال میں داغ نے اپنی شاعری میں موزونیت اور توازن کے ساتھ ساتھ ترنم کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔درج ذیل اشعار میں مندرجہ بالا خوبیاں دیکھی جا سکتی ہیں:

کی ترک مے تو مائل پندار ہو گیا
میں توبہ کر کے اور گنہگار ہو گیا

جو سر میں زلف کا سودا تھا سب نکال دیا
بلا ہوں میں بھی کہ آئی بلا کو ٹال دیا

وہ آئیں شب وعدہ یقین نہیں اے دل
چراغ گھی کے جلاؤں یہ ایسی شام نہیں

داغ نے جہاں بھی محاورے کا استعمال کیا ہے وہیں ہر محاورہ مصرعے میں ضم ہو کر رہ گیا ہے۔اس سے مصرع میں روانی، شگفتگی اور برجستگی پیدا ہو گئی ہے اور اس سے مصرع اور شعر ضرب المثل بن گئے ہیں اور آج بھی عام گفتگو میں ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

ع بہت دیر کی مہرباں آتے آتے
ع خود بخود عیب سے ہو جائے گا سامان کوئی
ع جانے والی چیز کا غم کیا کریں
ع رہنا ہے ایک پاؤں ہمارا رکاب میں

www.urduacademyts.com

ضرب المثل اشعار:

دیکھنا رشک اس کی محفل میں
ایک کو ایک کھائے جاتا ہے
دل لگی دل لگی نہیں ناصح
تیرے دل کو ابھی لگی ہی نہیں
زباں ہلاؤ تو ہو جائے فیصلہ دل کا
اب آچکا ہے لبوں پر معاملہ دل کا

داغؔ نے محاوروں کا خود بھی اہتمام کیااور اپنے شاگردوں کو بھی اس کے بارے میں لکھا ہے۔ان کے بیشتر خطوط سے اس کی غمازی ہوتی ہے۔ایک خط میں ناطق گلاوٹھی کو لکھا تھا کہ:

''یہ خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ،مگر اس کا لحاظ رکھئے کہ شعر کے لیے محاورہ آجائے۔محاورے کے لیے شعر میں سقم نہ آنے پائے،اور یہ بھی خیال رکھئے کہ اس میں تصرف جائز نہیں اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہٖ بحر میں آجائے تو نظم کر دیجیے ورنہ نہیں۔''

(رفیق مارہروی۔''زبان داغؔ''۔۱۹۵۹ء۔ص ۲۸۱)

یہ تھی محاوروں کے استعمال کے بارے میں داغؔ کی احتیاط۔داغؔ کے نزدیک محاورے کو جوں کا توں استعمال کیا جانا چاہیے اور محاورہ شعر کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ شعر محاورے کے لیے۔وہ نہیں جانتے تھے کہ کوئی محاورہ غلط استعمال کیا جائے۔ایک اور خط میں مشرف یار خاں مشرف کو تحریر کیا ہے:

''مجھ کو دیوان دیکھنے کی فہرست کہاں جو میرے مسلک کے خلاف ہو نکال دو۔البتہ ایک کھٹکا ہے کہ کوئی محاورہ خلاف نہ بندھا ہو۔''

(رفیق مارہروی۔''زبان داغؔ''۔۱۹۵۹ء۔ص ۳۷)

محاورے کے استعمال کے لیے داغؔ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر ذرا بھی شبہ ہوتا کہ محاورہ صحیح نہیں ہے تو وہ اپنی اہلیہ سے مدد لیا کرتے تھے جن کا تعلق قلعہ معلیٰ سے ہی تھی۔امیر مینائی کو لکھے ایک خط میں اس کا ذکر موجود ہے۔

''مرحومہ زبان اردو پر بہت قابض تھیں۔اکثر محاورے میں مجھ کو مدد ملتی تھی۔''

(رفیق مارہروی۔''زبان داغؔ''۔۱۹۵۹ء۔ص ۱۱۷)

داغؔ نے قلعہ معلیٰ کی ٹکسالی اور دلی کی بولی ٹھولی کی زبان کو برمحل اور موزوں محاوروں میں سے اردو شاعری میں جو انوکھا پن ، بے ساختگی اور برجستگی پیدا کی ہے وہ کم شاعروں کے حصے میں آئی ہے۔داغؔ کے کلام میں زبان کی شوخی ، بیان کی رنگینی ، روزمرہ اور محاورے کا برمحل اور موزوں استعمال اردو کا کوئی مورخ ایسا نہیں جو زبان کے سلسلے میں ان کی خدمات سے صرف نظر کر سکے۔مرزا فرحت اللہ بیگ کی رائے حقیقت پر مبنی ہے جو انہوں نے داغؔ کی زبان کے بارے میں قائم کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''میری تو رائے یہ ہے کہ جو زبان داغؔ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی ، ذرا زبان کی شوخی ، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجیے اور داد دیجیے:

www.urduacademyts.com

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانے''

مرزا فرحت اللہ بیگ۔''دہلی کی آخری شمع''۔اردو (اکادمی، دہلی۔۱۹۹۸ء۔ص۱۳۳)

اختر اورینوی نے داغؔ کی زبان ی مدح سرائی اس طرح کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''داغؔ کی زبان دانی اس کے لہجے میں تنوع اور پختگی پیدا کرتی ہے۔وہ بڑی نفاست سے یہاں کی نوک پلک درست کرتا ہے۔محاوروں کا استعمال بڑے سلیقہ اور قرینہ کا ہوتا ہے۔وہ بڑا فقرہ باز اور شیوہ بیان ہے اس کے کلام میں چٹخارہ ہوتا ہے۔''

(پروفیسر اختر اورینوی۔''داغؔ کی شاعری میں لب و لہجہ کی اہمیت''۔نگار ۔''داغؔ نمبر''۔ لکھنؤ۔جنوری فروری۔ سنہ۱۹۵۳ء۔)ص ۳۷

اور فراقؔ کا کہنا ہے کہ:

''اردو شاعری نے داغؔ کے برابر کا فقرہ باز نہ آج تک پیدا نہیں کیا ہے نہ آئندہ پیدا کر سکے گی۔''

(پروفیسر فراقؔ گورکھپوری۔''داغؔ''۔نگار ،''داغؔ نمبر''۔ لکھنؤ۔جنوری فروری۔سنہ۱۹۵۳ء۔ص۹۹)

مندرجہ بالا آرا حقیقت پر مبنی ہیں کیونکہ داغؔ کے کلام میں جو فقرہ بازی، شیوہ بیانی اور جو چٹخارہ ہے وہ صرف انہیں کا حصہ ہے اور اس کی وجہ سے داغؔ جانے پہچانے جاتے ہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ داغؔ کی پوری شاعری زبان اور محاورہ کی شاعری ہے تو غلط نہ ہوگا۔اگر میرؔ کہہ سکتے ہیں:

''مستند ہے میرا فرمایا ہوا''

تو پھر داغؔ کے مندرجہ ذیل اشعار بھی یقیناً قابل قدر ہیں۔جس میں انہوں نے اپنی زبان اور شاعری پر فخر کا اظہار کیا ہے۔مثلاً

مدعی کوئی بھی میدان سخن میں نہ رہا
تو نے کیا معرکہ اے داغؔ سخنور مارا

اللہ اللہ رے تری شوخ بیانی اے داغؔ
ست اک شعر نہ دیکھا ترے دیواں میں کبھی

داغؔ ہی کے دم سے تھا لطف سخن
خوش بیانی کا مزہ جاتا رہا

زبان کے سلسلے میں داغؔ کو کچھ ایسی خصوصیات حاصل ہیں جو اردو کے کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔داغؔ نے اپنی شاعری میں روزمرہ اور محاورہ، سادگی و صفائی، بے ساختگی اور اثر انگیزی، الفاظ کی معنویت اور رمزیت، محاکاتی رنگ اور ترنم، شوخی اور دل لبھانے والی کیفیات کو پیش کر کے اردو شاعری کے میدان کو مالا مال کر دیا ہے۔اس پر قلعہ معلی کی ٹکسانی اور دلی کی بولی ٹھولی کی زبان نے نہ صرف ان کی شاعری کو لافانی بنادیا ہے بلکہ اردو زبان کے دامن کو جو وسعت دی ہے وہ انہیں اردو شاعری میں ہمیشہ زندگی رکھے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)
نظامت فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
موبائل: 9491971786

www.urduacademyts.com

میراجی کے اَحوال و آثار

یہ مضمون ایک طرح سے خراجِ عقیدت ہے میراجیؔ کے لیے جن کی پیدائش کے اَب ایک سو دس برس ہو رہے ہیں ۔ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے نئی نسل کی آمد آمد ہوتی ہے اور پرانی نسل وقت کے دھارے میں بہتے چلی جاتی ہے ۔ لیکن ہم اپنے بزرگ اَدیب، شاعر، محقق، نقاد و دانشوروں کی بیش بہا خدمات کے علاوہ اُن کی قدیم روایات سے بغاوت کو بھی کبھی فراموش نہیں کر سکتے ۔ یہاں اِس مضمون میں بھی میراجی کے حالاتِ زندگی اور اُن کے اَدبی کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے ، تاہم ایک قاریِ اَدب ، طالبِ علم و ریسرچ اسکالر کو اِس مطالعے کے بعد کچھ دلچسپی پیدا ہو اور وہ مزید کی تلاش میں میراجی کے مطالعہ کی طرف راغب ہوجائے ۔

•

میراجی ، جن کا اصل نام محمد ثناء اللہ ڈار تھا ۔ ۲۵ رمئی ۱۹۱۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے ۔ اُن کے والد منشی مہتاب الدین ڈار ریلوے اِنجینئر تھے ، اُن دنوں اُن کے والد گودھرا ضلع پنچ محل گجرات کاٹھیاواڑ میں بہ حیثیت اَسسٹنٹ انجینئر متعین تھے ۔ میراجی پندرہ ماہ کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ گجرات پہنچے ۔ بہ قول وجیہہ الدین احمد:

''جب میراجی ۶ (چھ) برس کے تھے اُن کے والد اپاوا گڈھ کے دامن میں ایک قصبے ہالول پر متعین تھے ۔ یہیں میراجی کو اسکول میں داخل کیا گیا ۔ میراجی کی اکثر تحریروں میں اس مقام اور ماحول کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ یہیں گھنے جنگلوں میں میراجی اپنے بھائیوں اور بہن کے ساتھ ریل گاڑی یا پھر شکار کا کھیل کھیلا کرتے تھے ۔ {وجیہہ الدین احمد : ''سرگذشتِ میراجی''، مضمون مشمولہ سہ ماہی ''شعر و حکمت ۔ دورِ سوم ۔ کتاب: ایک'' (ص:۲۱) ۔ اشاعت: ۱۹۸۷ء}

منشی مہتاب الدین کے مختلف شہروں میں تبادلہ ہوتے رہنے کی وجہ سے میراجیؔ کی تعلیم و تربیت بھی مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ہوتی رہی ۔ بالآخر وہ لاہور میں رہائش پذیر ہوئے ۔ میراجی نے کم عمری سے ہی شاعری کا آغاز کیا ، اِبتداء میں ''ساحریؔ''، تخلص اِستعمال کرتے تھے ۔ یہاں لاہور کی زندگی میں ''میرا سین'' نامی ایک بنگالی لڑکی (لاہور ہی کے ایک اکاؤنٹس آفیسر کی بیٹی تھی) اُن کی زندگی میں داخل ہوئی اور اَب محمد ثناء اللہ کی زندگی اِس طرح بدل گئی جیسے نیا جنم لیا ہو ۔ یک طرفہ عشق میں اِس طرح ڈوب گئے کہ اُنھوں نے اپنا اَدبی نام (تخلص) بھی ''میراجی'' رکھ لیا، کیوں کہ ''میرا سین'' کو اُن کی

یادِ رفتگاں

www.urduacademyts.com

سہیلیاں ''میراجی'' کہا کرتی تھیں۔

میراجی ۱۹۳۷ء میں رسالہ ''اَدبی دنیا'' (لاہور) کے نائب مدیر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں وہ حلقہء اَربابِ ذوق سے وابستہ ہوئے ایسے کہ فوراً اِس حلقہ کی روحِ رواں بن گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران آل اِنڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل احمد شاہ بخاری (پطرس بخاری) نے تقریباً سبھی اہم اَدیبوں کو دِلّی بلوالیا تھا، جن میں محمود نظامی، انصار ناصری، ن۔م۔ راشد، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو اور میراجی وغیرہ شامل تھے۔ اس طرح میراجی ۱۹۴۱ء میں آل اِنڈیا ریڈیو (دہلی) میں ملازمت اختیار کی۔ لیکن میراجی اپنے لاوبالی مزاج کی وجہ سے زیادہ دنوں تک مستقل ملازمت نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ یہاں وہ ماہ نامہ ''ساقی'' (دہلی) کے لیے اَدبی کالم بھی لکھتے رہے۔ ''بھارت پیڈیا'' انگلش ویب سائیٹ کے مطابق:

''ملک کی تقسیم کے بعد میراجی ہمیشہ کے لیے بمبئی چلے گئے۔ اُن دِنوں اَختر الایمان نوشادی شدہ تھے اور میراجی اُن کے گھر مہمان رہے اور اُنھیں کے ساتھ میراجی اپنے آخری اَیام پونے اور بمبئی میں گزارے، کثرتِ شراب اور سگریٹ نوشی کی وجہ سے اِن کی صحت بہت خراب رہتی تھی۔'' {Meeraji-Bharatpedia}

۱۹۴۸ء میں اختر الایمان اور مدھوسدھن کے ساتھ ماہ نامہ ''خیال'' (بمبئی) سے جاری کیا، جس کے سات (۷) شمارے ہی شائع ہوئے تھے کہ یہ اُردو اَدب میں باغی شاعر کے نام سے شناخت بنانے والا، ن۔م۔ راشد کی طرح اُردو نظم کی روایت سے مکمل بغاوت کرنے والا اور اپنی منظومات کو موضوع و تکنیک ہر دو لحاظ سے بالکل نئے رنگ میں پیش کرنے والا اُردو اَدب کا یہ باکمال شاعر، مترجم، اور روایت شکن ۳۷ سال کی عمر میں ۳ر نومبر ۱۹۴۹ء کو کنگ ایڈورڈ میموریل ہاسپٹل بمبئی میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوئے اِس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

●

میراجی کے مختلف اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے ساتھی سعادت حسن منٹو لکھتے ہیں:

''میراجی نے شاعری کی، بڑے خلوص کے ساتھ۔ شراب پی، بڑے خلوص کے ساتھ۔ بھنگ پی، وہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ۔ لوگوں سے دوستی کی، اور اُسے نبھایا۔ اپنی زندگی کی ایک عظیم ترین خواہش کو جل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکا فریب کرنے کا اہل نہیں رہا۔ اِس اہلیت کے اِخراج کے بعد وہ اِس قدر بے ضرر ہو گیا تھا کہ بے مصرف سا معلوم ہوتا تھا۔ ایک بھٹکا ہوا مسافر جو نگری نگری پھر رہا ہے، منزلیں

www.urduacademyts.com

قدم قدم پر اپنی آغوش اِس کے لیے وا کرتی ہیں ۔مگر وہ اُن کی طرف دیکھے بغیر آگے نکلتا جا رہا ہے۔۔۔کسی ایسی جگہ، جس کی کوئی سمت ہے نہ رقبہ۔۔۔ایک ایسی تکون کی جانب جس کے ارکان اپنی جگہ سے ہٹ کر تین دائروں کی شکل میں اِس کے گرد گھوم رہے ہیں۔''

{سعادت حسن منٹو۔مضمون: تین گولے۔}

میراجی انگریزی اور ہندی پر عبور رکھتے تھے ، فارسی اور سنسکرت سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔وہ ایک اچھے شاعر ہی نہیں ایک صاحبِ طرز اَدیب اور تنقید نگار بھی تھے۔اُن کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

شاعری میں:

(۱) میراجی کے گیت

(۲) میراجی کی نظمیں

(۳) گیت ہی گیت

(۴) پابند نظمیں

(۵) تین رنگ (نظموں، غزلوں اور گیتوں کا مجموعہ)

(۶) خیمے کے آس پاس (عمر خیام کی رباعیوں کا منظوم اُردو ترجمہ) اس کے علاوہ مولانا صلاح الدین کے ساتھ گیت مالا ترتیب دی جو اِدارہ ءاَدبی دنیا سے شائع ہوئی۔

اور نثری تحریروں میں:

(۱) اُس نظم میں

(۲) مشرق و مغرب کے نغمے

(۳) نگارخانہ (دامودر گپت کی کتاب کٹنی متم کا اُردو ترجمہ)۔ان کے علاوہ میراجی نے مختلف شاعروں اور اَدیبوں کی کتابوں پر دیباچے بھی لکھے ہیں۔

بہ حیثیت شاعر میراجی کی شاعری پر ایک نظر ڈالتے ہیں، یہاں اُن کی ایک نظم ''اَے دوست کبھی لاہور نہ آ'' پیش ہے، جس میں اُس دور کے حالات کو بہت ہی خوبصورتی سے قلم بند کیے ہیں، پہلا اور آخری بند ملاحظہ فرمائیں:

اَے دوست کبھی لاہور نہ آ
اَے دوست کبھی لاہور نہ آ
سائکل پہ اگر تو بیٹھے گا
اور لیمپ نہ آگے رکھے گا
گر دِن بھی ہو ، وردی والا
ہر موڑ پہ تجھ کو روکے گا
اور بولے گا چالان لکھا
اَے دوست کبھی لاہور نہ آ
لاہوری ڈھول کو دور سے سن
کانوں کو اس کی بھائے صدا
اور شاید میں غلطی پر ہوں
اور گھر کی مرغی دال آسا
جو کچھ ہے یہی میں کہتا ہوں
اَے دوست کبھی لاہور نہ آ

●

www.urduacademyts.com

ساتھ ہی ایک غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں:

حقیقت میرے دل کی آپ پر عریاں نہ ہو جائے
جواب تک راز تھا وہ آج پرُ افشاں نہ ہو جائے
یہ ممکن ہے کہ یوں میں اپنی منزل تک پہنچ جاؤں
مگر یوں راہ جو دشوار تھی آساں نہ ہو جائے
یہ مانا قربِ دوری سے زیادہ زیست پرور ہے
دلِ حیراں کہیں کچھ اور بھی حیراں نہ ہو جائے

●

قدیم روایت سے بغاوت کرتے ہوئے میراجی نے تنقید کی جو بنیاد ڈالی اُس کے چند نظریات یہ ہیں: حلقہ ءاَربابِ ذوق کے جلسوں میں تنقیدی گفتگو۔نظموں کے تجزیاتی مطالعے۔اُردو شاعری کے بارے میں مختلف مضامین میں تنقیدی آرا اور مشرق و مغرب کے نامور شعرا کے تراجم کے ساتھ شاعروں اور اُن کے عہد پر بھی تنقیدی آرا وغیرہ شامل تھے۔جس میں مشرق و مغرب کے اِمتزاج سے تنقید کا ایک ایسا رنگ روشناس کرایا جس میں نظریہ سازی کے ساتھ ساتھ مشرقی تجزیہ پسندی کا رویہّ بھی تھا۔

(۱) میراجؔی نے حلقہ ءاَربابِ ذوق کے جلسوں میں تنقیدی گفتگو سے ایک معیار قائم کرتے ہوئے، نوجوان قلم کاروں کو تنقید کرنے پر اُکسایا اور تنقید برداشت کرنے کا ظرف بھی سکھایا، تجزیے اور ہیئت و تکنیک کی اہمیت کو بھی اُجاگر کیا، اور حلقہ کو تاثراتی تنقید سے نکال کر نفسیاتی و جمالیاتی اقدار سے ہم آہنگ کیا۔

(۲) نظموں کا تجزیاتی مطالعہ: اِس میں میراجی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے فن پارے کا تجزیہ کرکے فن کار اور فن پارے کے درمیان رشتہ کو تلاش کرنے اور اس طرح تخلیق کے سفر کو سمجھانے کی کوشش کی ہے جس کے توسط سے فن پارہ وجود میں آتا ہے۔''اس نظم میں'' کے تحت کیے گئے تمام تجزیے اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔''اس نظم میں'' جن نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے وہ اپنے موضوع اور ہیئت کے حوالے سے اپنے عہد کی اہم نظمیں ہیں۔اِن کے موضوعات بھی مختلف ہیں یعنی یہ نظمیں معاشرتی، سیاسی،نفسیاتی اور زندگی کے کئی دوسرے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ہیئت کے اعتبار سے بھی اِن میں بڑا تنوع ہے،بعض قدیم ہیئت یعنی رباعی، قطعہ اور مثنوی کے انداز میں ہیں اور بعض غیر روایتی ہیئت میں ہیں،جن میں آزاد اور معرّیٰ کے علاوہ پابند ہیئت بھی شامل ہے۔اسی طرح اِن میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کی تفریق بھی نہیں ہے بلکہ ہر وہ نظم جو کسی بھی حوالے سے اہم ہے اس میں شامل کی گئی ہے۔

(۳) اُردو شاعری کے بارے میں مختلف مضامین میں تنقیدی آرا: یہاں نظموں کے تجزیے کے ساتھ

ساتھ میراجی کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ وہ تنقیدی جائزے اور تعارف ہیں جو مشرق و مغرت کے مختلف شاعروں کو اُردو میں متعارف کروانے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اِن تنقیدی جائزوں کی تین مختلف باتیں بتائی ہیں۔ اوّل شاعروں کے کلام کو اُن کے ذاتی حالات اور اُن کے عہد کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش۔ دوم یہ کہ کلام کا جائزہ لیتے ہوئے مروّج فنی اَقدار اور اُس زبان کے اَدب کی بنیادی اَقدار کو سامنے رکھا جائے۔ سوم جائزوں میں تقابلی مطالعہ بھی کیا جائے۔ یہ تمام نظریات بھی اُردو اَدب میں میراجی ہی کی دین ہیں۔

اس مضمون کے آخر میں یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ میراجی کی جدت پسندی اور روایت سے بغاوت جیسی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اُن کے اپنی کمزوریاں، مجبوریاں بھی اپنی جگہ مسلم ہیں، جنھیں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِنسان وقت کے ہاتھوں کتنا بے بس ہے، میراجی کی اِس بے بسی کو اگر دیکھنا ہوتو اُن کو لکھے ہوئے خطوط یا میراجی کے لکھے ہوئے خطوط جیسے ''میراجی کا خط ن۔م۔راشد کے نام''، ''محمد حسین کا خط میراجی کے نام''، ''میراجی کا خط قیوم نظر کے نام''، ''میراجی کا خط بنام وشوانندن بھٹناگر کے نام''، ''وشوانندن کا جوابی خط میراجی کے نام''، ''وشوانندن کے خطوط میراجی کے نام'' اور ''وشوانندن کے خطوط اختر الایمان کے نام'' کا مطالعہ بھی بے حد ضروری ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ، ویرانے پہ کیا گذری ؟

•◆•

ڈاکٹر جعفر جری
پرنسپل، یونیورسٹی کالج آف آرٹس اینڈ سوشیل سائنس،
ساتاواہنا یونیورسٹی، کریم نگر۔505002 (تلنگانہ اِسٹیٹ)

زندگی میں آگے بڑھنے کا طریقہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک بادشاہ کو دو باز تحفے میں ملے. اس نے اتنے خوبصورت پرندے کبھی نہیں دیکھے تھے. بادشاہ نے دونوں پرندے اپنے ملازم کو دیے کہ وہ ان کی تربیت کرے. ایک دن ملازم نے بادشاہ کو بتایا کہ ایک پرندہ اونچی اڑان اڑ رہا ہے اور دوسرا جس دن سے آیا ہے اپنی شاخ سے نہیں اڑ پا رہا. بادشاہ نے مملکت کے تمام معالجوں اور جادوگروں کو طلب کر لیا لیکن کوئی اس باز کو نہ اڑا سکا. بادشاہ نے اپنے مشیروں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا. گھنٹے دن اور دن مہینوں میں ڈھل گئے لیکن باز نہ اڑ سکا. بادشاہ نے کسی ایسے شخص کو بلانے کا فیصلہ کیا جو قدرت سے گہری دلچسپی رکھتا ہو. بادشاہ نے اپنے مشیروں کو حکم دیا کہ کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ کر لاؤ جو برسوں جنگلات میں گزار چکا ہو. اگلے دن بادشاہ باز کو محل کے باغوں میں اڑتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گیا. بادشاہ نے اس شخص کو طلب کیا جس نے باز کو اڑایا تھا. بادشاہ نے اس سے پوچھا تم نے باز کو کیسے اڑایا؟ وہ مسکرا کر بولا میں نے وہ شاخ کاٹ دی جس پر باز بیٹھا تھا. اس لئے کہ وہ شاخ باز کی اڑان میں رکاوٹ بن رہی تھی۔۔۔

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ ہماری زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع بہت ہوتے ہیں لیکن ہم آگے بڑھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے. ہم اپنی آسائشوں سے قدم باہر ہی نہیں نکالتے. ایک جگہ جم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نئی آزمائشیں اور نئے تجربے ہی زندگی میں آگے بڑھنے کی وجہ بنتے ہیں. آزمائشوں کا مقابلہ کریں۔ یہی کامیابی کا واحد رستہ ہے..

ماخوذ

یادِ رفتگاں

www.urduacademyts.com

پروفیسر مسعود حسین خان
سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر یوسف حسین خان

(حیات، خاندان، وطن، بچپن، تعلیم، ملازمت)

یوسف حسین خاں کا تعلق قائم گنج، ضلع فرخ آباد (یوپی) کے ایک معزز پٹھان گھرانے سے تھا، جس کے مورث اعلیٰ حسین خاں، 'مدآخون' (بڑے استاد)۔ اپنے توام بھائی حسین خاں کے ہمراہ شمال مغربی سرحدی صوبہ (موجودہ پاکستان) کے 'تیرہ' آزاد قبائلی علاقے کی سکونت ترک کر کے تلاش معاش میں ۱۷۱۵ء کے قریب نوابان بنگش کی ریاست میں قصبہ قائم گنج میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کا تعلق آفریدی قبیلے سے تھا اور 'خیل' موّل خیل' تھا۔ قائم گنج کے قصبے کے باہر اس نام کا محلّہ اب تک آباد ہے۔ مدآخون، پٹھانوں کے معلم، مرشد اور صوفی باصفا تھے۔ ان کے بیٹے اور پوتے احمد حسین خاں اور محمد حسین خاں نے قلم کے بجائے شمشیر ہاتھ میں لی اور مختلف رجواڑوں میں سپہ گری کی خدمات انجام دیں۔ یوسف حسین خاں کے دادا غلام حسین خاں (عرف جھمن خاں) بھی ریاست حیدرآباد کی ایک کن ٹن جنٹ میں فوجی خدمات انجام دیتے رہے لیکن ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے وطن کی سیدھ لی اور اپنی کاشت اور باغات کی دیکھ بھال میں باقی زندگی گزار دی۔ ان کے بڑے بیٹے عطا حسین خاں نے باپ کی پیروی کرتے ہوئے حیدرآباد ہی میں فوجی ملازمت اختیار کر لی لیکن چھوٹے بیٹے فدا حسین خاں نے حیدرآباد جا کر وکالت کا امتحان پاس کیا اور اس دھوم دھام کے ساتھ وکالت کی کہ جب ۱۹۰۷ء میں ۳۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا تو ان کا شمار حیدرآباد ہائی کورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا تھا۔ ہُن برسنے لگا تو انھوں نے ہائی کورٹ کے مقابل، موسی ندی پار، بیگم بازار میں ایک دو منزلہ عمارت تعمیر کرائی اور ایک پختہ حویلی اپنے والد غلام حسین خاں کی زیر نگرانی آبائی وطن قائم گنج میں بنوائی، جو عرفِ عام میں، اس کے شاندار روکار کی وجہ سے جھمن خاں کا محل کہلانے لگا۔

فدا حسین خاں کے نازنین بیگم (عرف رَجّو) کے بطن سے سات بیٹے پیدا ہوئے۔ یوسف حسین خاں ان کی پانچویں اولاد تھے۔ ذاکر حسین خاں (سابق صدر جمہوریہ ہند) ان سے بڑے اور محمود حسین خاں، ان کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ یوسف حسین کی پیدائش حیدرآباد کے بیگم بازار والے مکان میں ۱۸ ستمبر ۱۹۰۲ء کو ہوئی تھی۔ ابھی وہ پانچ برس کے تھے کہ فدا حسین خاں نے عین عروج کے زمانے میں ۱۹۰۷ء میں دق کے مرض میں انتقال کیا۔ ناچار ان کی والدہ کو اپنے چھوٹے بچوں کی ٹولی کے ساتھ وطن قائم گنج لوٹنا پڑا۔ قائم گنج میں تعلیم کا مناسب انتظام نہ ہونے کے باعث

www.urduacademyts.com

بڑے بیٹوں کو اسلامیہ ہائی اسکول' اٹاوہ میں داخل کر دیا لیکن یوسف حسین عمر کم ہونے کی وجہ سے' قائم گنج میں والدہ ہی کے پاس رہے جہاں ایک مولوی صاحب قرآن شریف اور اردو کا درس دینے لگے۔ نو برس کی عمر ۱۹۱۱ء میں' وہ بھی اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کر دیے گئے۔ جہاں ان کے تین بڑے بھائی پہلے سے موجود تھے۔ اسی سال ان کی والدہ کا طاعون کی وبا میں انتقال ہو گیا۔ یہ وبا یوسف حسین کے چھوٹے بھائی جعفر حسین کو بھی لے گئی۔ اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول سے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں (راقم السطور کے والد ماجد) کچھ عرصہ کے بعد علی گڑھ آ گئے تو یوسف حسین کو علی گڑھ کے گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اس اسکول میں انھوں نے تین سال تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں اپنے سب سے چھوٹے بھائی محمود حسین کے ساتھ دوبارہ اٹاوہ چلے گئے۔ وہاں سال بھر ہی قیام کیا ہوگا کہ سخت بیمار پڑ گئے۔ خیال تھا کہ خاندانی مرض دق کے آثار ہیں' اس لیے رائے ہوئی کہ تحصیل علم کا سلسلہ ترک کر کے کچھ عرصہ تک قائم گنج کی کھلی فضا میں رہا جائے۔ قائم گنج میں صحت بنانے کی فکر میں ان کا قیام دو سال تک رہا۔ اسی زمانے میں ترک موالات کی تحریک زور شور سے شروع ہوئی اور خلافت کمیٹی کے کارکنوں کا قائم گنج بھی آنا جانا شروع ہوا۔ یوسف حسین کی صحت جوں ہی ذرا ٹھیک ہوئی وہ قومی تحریک کے دھارے میں کود پڑے اور کانگریس اور خلافت دونوں کے لیے کام شروع کر دیا۔ بمبئی کے مرکزی خلافت کمیٹی کی ہدایات کے مطابق' میں نے اور محمود میاں نے اپنے سب بدیسی کپڑے خلافت کمیٹی کے صدر دفتر کے پتے پر بھجوا دیے' اور کھدر کے کپڑے پہن لیے۔''
(یادوں کی دنیا)۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون اور تحریک خلافت کی لہر پر مسلم یونی ورسٹی' علی گڑھ کے بطن سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ یوسف حسین نے کالج کی پہلی کلاس میں اور محمود حسین نے اسکول میں۔ ''مولانا محمد علی' اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے زیادہ تر باہر رہتے تھے اور ان کی جگہ عبدالمجید خواجہ پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ تاہم یوسف حسین' مولانا محمد علی کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر رہے اور ان کے درسیات سے فیض اٹھایا۔ ان کے علاوہ انھوں نے مسٹر کیلاٹ' مولانا اسلم جیراج پوری' مولانا عبدالحیٔ' مولانا سورتی اور مولانا شرف الدین ٹونکی جیسے جید اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ خاص طور پر مسٹر کیلاٹ کی' جو ایک مالا باری عیسائی تھے اور قومی دھارے کی رو میں جامعہ ملیہ تک آ گئے تھے' علمیت سے بہت زیادہ مرعوب رہے۔ انھوں نے یوسف حسین کو علوم تاریخ اور سیاست کا چسکہ لگایا۔ تاریخ اسلام کی درسیات مولانا اسلم جیراج پوری سے حاصل کیں ''جن کی نظر قرآن پر بہت گہری تھی۔'' وہ اس عہد کے عالموں میں سب سے زیادہ جدت پسند ذہن رکھتے تھے۔ تقلیدِ جامد کے مخالف اور اجتہاد کے علم بردار تھے۔ مولانا شرف الدین ٹونکی نے یوسف حسین کے ادبی ذوق کی تربیت کی۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں رسالہ جامعہ کا پہلا شمارہ شائع ہوا' جس سے ان کی

www.urduacademyts.com

مضمون نگاری کی آغاز ہوا۔

جامعہ کے طالب علم کی حیثیت سے یوسف حسین نے احمد آباد (۱۹۲۱ء) اور کان پور (۱۹۲۵ء) کے انڈین نیشنل کانگریس کے جلسوں میں شرکت کی۔ احمد آباد میں انھوں نے مولانا حسرت موہانی کی حریت کا وہ مظاہرہ دیکھا جس میں مہاتما گاندھی کی ڈومینین اسٹیٹس کی تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی مکمل سوراج کی تجویز پیش کی۔ ہر چند یہ صدا بہ صحرا ثابت ہوئی لیکن نوجوان یوسف حسین کا ذہن اس سے بہت متاثر ہوا اور اس کے بعد وہ عمر بھر مولانا حسرت موہانی کے جذبہ حریت کے قائل رہے۔ ۱۹۲۴ء میں یوسف حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بزم اتحاد (اسٹوڈنٹس یونین) کے صدر منتخب ہوئے۔ کچھ عرصے بعد رسالہ ''جامعہ'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اسی سال گرمیوں کی تعطیلات میں کشمیر جاتے ہوئے لاہور میں علامہ اقبال سے ملاقات کی۔

جامعہ ملیہ میں ۵ سال رہ کر یوسف حسین نے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کی۔ ایک لحاظ سے وہ اس ادارے کے قومی تعلیم کے تجربے کی پہلی پیداوار تھے۔ یہیں انھیں اسلامیات اور تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسی کی فضا میں انھوں نے اردو زبان و ادب کو آئندہ کے لیے اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنایا۔ ان کا تعلق اس نسل سے تھا جس نے ثابت کر دیا کہ اردو ذریعۂ تعلیم سے بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بنایا جاسکتا ہے۔

چوں کہ جامعہ ملیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے اس وقت انگلستان کی یونی ورسٹیوں کے دروازے بند تھے اس لیے مئی ۱۹۲۶ء میں یوسف حسین اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے فرانس روانہ ہو گئے۔ قیام فرانس کا ان کے علمی و جمالیاتی ذوق پر گہرا اثر پڑا۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء سے وہ سور بورن (پیرس یونی ورسٹی) میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے باقاعدہ طالب علم ہو گئے۔ انھوں نے تحقیق کے لیے ''ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے صوفی اور سنت'' کا موضوع منتخب کیا اور اس کے لیے ان کے نگران کار دو جید مستشرقین' موسیولوئی ماسیوں اور موسیوژول بلوک مقرر کیے گئے۔ ان میں سے اول الذکر اسلامیات کے مشہور ماہر تھے جنھوں نے منصور حلاج پر معرکتہ الآرا تحقیق کی ہے اور دوسرے ہندیات کے مشہور عالم تھے۔ ان کے علاوہ موسیو سلوان لیوی اور موسیو فوشے کے درسیات سے بھی استفادہ کیا۔ پیرس میں ساڑھے تین سال قیام کرنے کے بعد انھوں نے یونی ورسٹی ڈاکٹریٹ (Doctrat d' University) کی ڈگری حاصل کی اور فوراً ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے۔

اب تلاش معاش کی فکر ہوئی۔ ابتدا میں مولوی عبدالحق کے ساتھ انھوں نے انگریزی اردو لغت میں کچھ عرصے تک کام کیا اور ان کی شخصیت اور صحبت سے بہت متاثر ہوئے۔

اس کے بعد اکتوبر ۱۹۳۰ء میں وہ جامعہ عثمانیہ کے

www.urduacademyts.com

شعبۂ تاریخ میں ریڈر کی اسامی کے لیے منتخب کر لیے گئے جہاں ترقی کر کے وہ بالآخر پروفیسر و صدر شعبہ ہو گئے۔ ۲۷ سال تک یونی ورسٹی کی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۵۷ء میں حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ تاریخ کی تدریس کے علاوہ وہ عرصے تک جامعہ عثمانیہ میں طلبہ کو فرانسیسی زبان کا درس بھی دیتے رہے۔ جامعہ عثمانیہ میں ان کے گہرے مراسم پروفیسر ہارون خان شروانی، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا، ڈاکٹر جعفر حسن، ڈاکٹر سید عبداللطیف، ڈاکٹر میر ولی الدین، مولوی الیاس برنی، مولوی مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر نظام الدین سے رہے۔ بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے کی جامعہ عثمانیہ علوم وفنون کے ستاروں کی کہکشاں تھی اور یوسف حسین کا ان میں ایک خاص مقام تھا۔

ان کی علمی دلچسپیاں صرف ادب اور تاریخ تک محدود نہیں تھیں۔ جامعہ ملیہ کے تعلیمی پس منظر کے ساتھ وہ علوم وفلسفہ اسلامی کے بھی ساری عمر طالب علم رہے۔ شعبۂ فلسفہ کے صدر پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم، اقبال پر ان کے مقالات سننے کے بعد اکثر کہا کرتے تھے۔ ''آپ کو تاریخ کے شعبہ کے بجائے فلسفہ کے شعبہ میں ہونا چاہیے تھا۔''

متذکرہ بالا عالموں کی پیشہ ورانہ صحبتوں کے علاوہ یوسف حسین کے معاصر ادیبوں اور شاعروں سے بھی خوش گوار تعلقات استوار رہے۔ ان میں حیدر یار جنگ نظم طباطبائی، فصاحت جنگ جلیل، آغا حیدر حسن، مرزا ہادی رسواؔ، فرحت اللہ بیگ، جوش ملیح آبادی اور فانی بدایونی جیسے سخنور اور سخن فہم شامل تھے۔ مولانا حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی کے تو وہ پرستار تھے اس لیے جب بھی یہ حضرات حیدرآباد آتے تو وہ ان سے ملاقات کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ جگر مرادآبادی بارہا ان کے یہاں مہمان ٹھہرے۔

جامعہ ملیہ تا جامعہ عثمانیہ، اردو زبان یوسف حسین کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ کیا تاریخ، کیا ادب اور کیا فلسفہ، اسی میں انھوں نے اپنا کمال دکھایا اور ثابت کر دیا کہ ایک ہندوستانی زبان کو اعلیٰ ترین سطح کی ذہنی کاوش کا وسیلۂ اظہار بنایا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد ہی میں ۱۹۴۸ء میں انھوں نے آصف جاہی حکومت اور جامعہ عثمانیہ کی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کے تاثرات انھوں نے اپنی خودنوشت میں اس طرح قلم بند کیے ہیں:

''مجھے حیدرآباد کی تباہی اور آصف جاہی خاندان کی حکمرانی ختم ہونے کا سخت افسوس تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں حیدرآباد میں پیدا ہوا تھا بلکہ جذباتی طور پر میں نے اپنے آپ کو حیدرآباد سے وابستہ کر لیا تھا۔۔۔۔ میں نے اپنے دوران قیام میں بارہا یہ محسوس کیا کہ اگر واقعی ملک کے کسی حصے میں متحدہ ہندوستانی تہذیب کے نقش ونگار دکھائی دیتے ہیں تو وہ صرف دکن ہیں۔'' یادوں کی دنیا، ص ۴۰۴-۴۰۳)

www.urduacademyts.com

۱۹۵۷ء میں ریٹائرڈ ہونے سے سال بھر قبل ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند نے یوسف حسین کو ایک ماہ کے لیے آسٹریلیا کی یونی ورسٹیوں میں ہندوستانی تہذیب پر لکچر دینے کے لیے بھیجا تھا' جو نہایت کامیاب رہے۔

جامعہ عثمانیہ کی ملازمت کے دوران ہی یوسف حسین نے' تقریباً سات سال حیدرآباد آرکائیوز میں پہلے کیوریٹر اور بعد کو مشیر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے وہاں مخزونہ منتخب تاریخی دستاویزات کی چھ جلدیں شائع کیں جو ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ پر کام کرنے کے لیے ناگزیر اور بیش قیمت مواد فراہم کرتی ہیں۔ ان میں فارسی متن کے ساتھ انگریزی میں ترجمہ بھی دیا گیا۔

حیدرآباد کے دورانِ قیام یوسف حسین کی متنوع علمی سرگرمیوں میں سہ ماہی رسالہ ''سیاست'' کا اجرا بھی شامل ہے جو پانچ سال تک پابندی سے شائع ہوتا رہا اور جس کی علمی حلقوں میں کافی شہرت ہوئی۔

ریٹائرڈ ہونے کے کچھ عرصے بعد ان کا انتخاب ۱۹۵۸ء میں انڈین نیشنل آرکائیوز کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ وہ وہاں جانے کے لیے پر تول ہی رہے تھے کہ مسلم یونی ورسٹی' علی گڑھ سے انھیں پرووائس چانسلری کی پیش کش ملی' جس کو انھوں نے سرکاری ملازمت پر ترجیح دی اور ۱۹۵۸ء میں وہ علی گڑھ آ گئے۔

بحیثیت پرووائس چانسلر انھوں نے مسلم یونی ورسٹی کی خدمت تقریباً سات سال تک کی اور اس دوران انھوں نے کرنل بشیر حسین زیدی' بدرالدین طیب جی اور نواب علی یاور جنگ' تین وائس چانسلروں کے ساتھ کام کیا۔ پرووائس چانسلر کی حیثیت سے وہ نہایت فعال ثابت ہوئے۔ بعض اوقات ان کے اور وائس چانسلر کے درمیان اختلاف رائے بھی رہا لیکن وہ علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کی کثرت میں بہت مقبول رہے۔ چوں کہ وہ اپنے مزاج اور فکر کے لحاظ سے بائیں بازو کے اساتذہ سے اختلاف رکھتے تھے اس لیے اس طبقہ نے ان کے خلاف خوب کیچڑ اچھالی اور مرکزی سرکار تک ان کے بارے میں بدظنی پھیلائی۔

اپنی پرووائس چانسلری کے دوران مسلم یونی ورسٹی کے تحقیقاتی مجلّہ ''فکر و نظر'' کے ایڈیٹر بھی رہے اور مولانا آزاد لائبریری کے کچھ عرصے تک اعزازی لائبریرین بھی' جہاں انھوں نے سرسید اور مسلم یونی ورسٹی کے بارے میں مخزونہ مواد کو جانفشانی کے ساتھ مرتب کیا۔

۱۹۶۵ء میں مسلم یونی ورسٹی کی پرووائس چانسلری سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ شملہ کے انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے فیلو ہو گئے اور شملہ میں قیام کیا' جہاں انھوں نے (Indo-Mislim Polity) کے نام سے ایک تحقیقی تصنیف لکھی علمی کام میں ان کے انہماک کا ذکر کرتے ہوئے شملہ انسٹی ٹیوٹ کے اُس وقت کے ڈائریکٹر پروفیسر نہار رنجن رائے نے راقم السطور سے ایک سیمینار کے موقع پر اُن کے بارے میں کہا تھا' یہ سن رسیدہ شخص جس

www.urduacademyts.com

لگن کے ساتھ اپنے علمی کام میں مصروف رہتا ہے کاش ہمارے نوجوان اسکالراس کا عشرِ عشیر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے۔''

شملہ سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد زندگی کے باقی ایام انھوں نے نظام الدین ویسٹ کے ایک مختصر سے کرائے کے مکان میں گزار دیے' جہاں وہ ہمہ وقت علمی کام میں منہمک رہتے۔ اسی زمانے میں انھوں نے غالبؔ اور اقبالؔ پر تابڑتوڑ تصانیف لکھیں اور ایک ایسے ادبی قرض کو واگذاشت کیا جس کا بوجھ وہ اپنے دماغ پر شروع سے محسوس کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں وہ انجمن ترقی اردو کے نائب صدر منتخب ہوئے جو وہ مرتے دم تک رہے۔ چند سال تک انھوں نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

میں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وائس چانسلر تھا تو اکثر ان کی خدمت میں اسی مکان میں حاضری دیتا۔ جب وہاں سے نکلتا تو عجب گھٹن ہوتی۔ اللہ اللہ جس شخص نے ساری عمر بنجارہ ہل (حیدرآباد) کی شاندار اور پرفضا کوٹھی میں بیٹھ کر علمی کام کیا ہو' اس کے بعد مسلم یونی ورسٹی کے پرووائس چانسلر کے وسیع بنگلے میں تصنیفی زندگی کے سات سال گزارے ہوں' اب نظام الدین کے ڈھائی کمرے کے کرائے کے مکان میں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر غالبؔ و اقبالؔ پر فکر کے موتی بہا رہا ہے! یقین نہیں آتا کہ وہ اس کال کوٹھری میں (جہاں ان کے سونے کا پلنگ بھی موجود تھا) علمی و ادبی زندگی کے لیے حوصلۂ قلم و رقم کیوں کر قائم رکھ سکے جب کہ اسی زمانے ان کے موتیا بند کے پے بہ پے دو آپریشن بھی ہوئے۔

انھوں نے مرتے دم تک قلم ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کے مرض الموت میں گرفتار ہونے سے صرف ایک روز قبل جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو بہت شاداں و فرحاں تھے اس لیے کہ اسی روز انھوں نے اپنی آخری تصنیف ''غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات'' کا دیباچہ مکمل کیا تھا۔

۵؍فروری تا ۲۱؍فروری (۱۹۷۹ء) وہ ہولی فیملی اسپتال میں نیم بے ہوشی کی حالت میں حیات و موت کے درمیان جھولتے رہے۔ جب بھی پرسش کے لیے ان کے کمرے میں گیا ہوں میں نے دیکھا کہ ان کی انگلیاں' جو اب قلم بن چکی تھیں بستر پر اسی انداز میں چل رہی تھیں' جیسے وہ باقی ماندہ ''جنوں کی حکایت خوں چکاں'' لکھ رہے ہوں! لیکن ان کی یہ تحریر اب کوئی نہیں پڑھ سکے گا!

☆☆☆

مضمون: از کتاب یوسف حسین خاں
ہندوستانی ادب کے معمار
مصنف: پروفیسر مسعود حسین خان
سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ' نئی دہلی

www.urduacademyts.com

رباعی کے فن کو آب وتاب عطا کرنے والا شاعر: علقمہ شبلی

ابوعلقمہ محمد شبلی المعروف بہ علقمہ شبلی یکم نومبر ۱۹۳۰ء کو میر غیاث چک ضلع نالندہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد حصولِ روزگار کے سلسلے میں کلکتہ گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ساری زندگی درس و تدریس کے پیشے سے منسلک رہے۔ ۱۳؍اگست ۲۰۱۹ء کو شبلی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ عصرِ حاضر کے معروف و معتبر شعرا میں علقمہ شبلی کا شمار ہوتا ہے۔ کئی شعری مجموعے ان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ نظم وغزل کے علاوہ رباعی گوئی بھی ان کا خاص میدان تھا۔ ''زادِ سفر'' ''چہار آئینہ'' ''شہر نامہ'' اور ''چہرہ نامہ'' کے عناوین سے شبلی کے چار مجموعہ ہائے رباعیات شائع ہو چکے ہیں۔ اول الذکر حمدیہ و نعتیہ رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ دوسرے مجموعے میں متفرق موضوعات کی حامل رباعیاں ہیں۔ ''شہر نامہ'' ایسی رباعیات کا مجموعہ ہے جس کی رباعیوں میں ہندوستان کے مختلف مشہور شہروں کے احوال و آثار، تاریخ وثقافت، خصوصیات و کیفیات قلمبند کی گئی ہیں۔ جب کہ ''چہرہ نما'' مذہبی، ادبی، علمی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی شخصیات پر کہی گئی رباعیات کا مجموعہ ہے۔

علقمہ شبلی کی رباعیات میں گہرائی و گیرائی بھی ہے اور فنی پختگی بھی۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا تھا۔ انھیں زبان پر بھی غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ بلا شبہ ان کا شمار فنِ رباعی کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ شبلی کی رباعیاں ان کے احساس کی شدت، فکر و خیال کی پاکیزگی اور لطافتِ بیان کی غمازی کرتی ہیں۔ علقمہ شبلی کی نستعلیق شخصیت ان کی رباعیوں میں جھلکتی ہے۔ وہ مذہبی اور تہذیبی اقدار کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ شبلی کی رباعیات کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ حمد و نعت، مذہبی اقدار، سماج و سیاسی انحطاط، اخلاق و کردار کی پستی، فرقہ وارانہ منافرت، مناظرِ فطرت، دنیا، زندگی انسان اور انسانی فطرت جیسے موضوعات ان کی رباعیوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل رباعیوں سے علقمہ شبلی کی عصری آگہی اور گہرے مشاہدے کی عکاسی تو ہوتی ہی ہے اس کے علاوہ دنیا جس دھماکا خیز صورتِ حال سے گزر رہی ہے اس پر ان کی تشویش کا اندازہ بھی ہوتا ہے:

بدلی ہوئی دنیا کی رفتار بھی ہے
پہلا سا نہ انساں کا کردار بھی ہے
اب جوہری طاقت کی ہر چار طرف
شہرِ دل و دیدہ پر یلغار بھی ہے

☆

ہر ایک کلی زرد ہوئی جاتی ہے
گلشن کی فضا گرد ہوئی جاتی ہے
ایسی ہے گھٹن، حبس کا عالم یہ ہے
جینے کی لگن سرد ہوئی جاتی ہے

www.urduacademyts.com

بدلی نظر آتی ہے دنیا کی فضا
ہے تیغ بکف میرے گلشن کی فضا
ہے آتش وخوں کا ہر سُو کھیل یہاں
سر اپنا چھپاؤں میں کس جا اے خدا

☆

خوں رنگ ہے آفاق کا منظر یا رب
ہے پیر فلک دیکھ کے ششدر یا رب
جائے بھی کہاں بندۂ عاصی تیرا
لٹکی ہوئی تلوار ہے سر پر یا رب

آج انسان نے آفاق کی تسخیر تو کرلی ہے لیکن انفس میں جھانکنے کی نہ اسے فرصت ہے نہ جستجو، چنانچہ انسان کی اس مادہ پرستانہ ذہنیت اور سوچ کے تناظر میں اس سے مخاطب ہوکر شبلی کہتے ہیں:

انساں نے قدم چاند پہ رکھاتو ہے
آفاق کو افلاک کو، چھانا تو ہے
اک قریۂ جاں ہے کہ رہا ہے اوجھل
دنیا کو ہر اک رنگ میں دیکھا تو ہے

☆

آکاش میں بھی تم نے علم لہرایا
پاتال میں بھی عزم تمھارا پہنچا
دنیا کا ہر اک گوشہ کھنگالا تم نے
دل میں بھی کبھی جھانک کے تم نے دیکھا؟

ooo

فکر وفن اور قرطاس وقلم سے اپنی اٹوٹ وابستگی کا اظہار بھی علقمہ شبلی کی رباعیات میں جھلکتا ہے۔ وہ حرمتِ فن اور تہذیبِ قلم کی پاس داری بہرصورت کرنا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ کریں:

نازاں ہے کوئی تاج وعلم پر اپنے
شاداں ہے کوئی جاہ وحشم پر اپنے
قسامِ ازل! شکر ہے تیرا لب پر
ہے فخر ہمیں لوح وقلم پر اپنے

☆

ہم زینتِ دربار نہ ہونے دیں گے
اک جنسِ خریدار نہ ہونے دیں گے
تہذیبِ قلم کے ہیں امیں، ہم اس کو
رسوا سرِ بازار نہ ہونے دیں گے

ooo

اقبالؔ کی طرح علقمہ شبلی کا بھی خیال ہے کہ گلزارِ فن کی آبیاری جب تک خونِ جگر سے نہیں کی جاتی تب تک اس میں بہار نہیں آتی۔ چنانچہ شبلی نے اپنے رنگ اور اسلوب میں کہا ہے:

تاریکیِ شب نورِ سحر سے روشن
الفاظ معانی کے گہر سے روشن
کچھ سہل نہیں شوق کی رَہ سر کرنا
ہے چہرۂ فن خونِ جگر سے روشن

☆

www.urduacademyts.com

درجِ ذیل رباعی سے علامہ شبلی کی تہذیب و شائستگی اور مروت و مودت کا اندازہ ہوتا ہے:

کرتے رہیں وہ ہم پہ مسلسل یلغار
جینا بھی ہمارا کریں وہ یوں دشوار
پھر بھی یہی کوشش ہے ہماری ہر پل
تہذیب کا گرنے نہیں پائے معیار

شبلی کی بعض رباعیات میں تیکھا طنز بھی محسوس ہوتا ہے۔مثلاً:

خود ساختہ افسانے سناتے رہیے
فرسودہ تصاویر دکھاتے رہیے
یوں آپ شب و روز بہ فیضِ جذبات
اوہام کو ایقان بناتے رہیے

☆

گم راہ کو ہے راہ بری کا دعویٰ
ہے سنگ کو بھی شیشہ گری کا دعویٰ
اب اہلِ نظر خیر منائیں اپنی
کم بیں کو بھی ہے دیدہ وری کا دعویٰ

نرسیں مریضوں کی جس خوش مزاجی سے خدمت کرتی ہیں اس سے ہم سب واقف ہیں۔شبلی نے ان کی خدمت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ایک رباعی میں انھیں بجا طور پر ''اجلی پریاں'' کہا ہے۔اس موضوع پر شاید ہی کسی نے رباعی کہی ہو۔کہتے ہیں:

خوش خلق و وفا پیکرِ شیریں گفتار
گلزار بہ لب اور محبت کردار
ہیں نرس کہاں ،یہ تو ہیں اجلی پریاں
خدمت کو مریضوں کی ہمہ دم تیار

''شہرنامہ'' سے بطورِ نمونہ دو رباعیاں پیش ہیں۔قنوج شہر عطر سازی اور عطر کی تجارت کے لیے مشہور ہے۔اس شہر سے متعلق رباعی بہ زبانِ شہر ملاحظہ کریں:

میں ہند کی تاریخ کا بابِ عظمت
ہر دور میں ملتی رہی مجھ کو رفعت
کرتا ہوں معطر میں مشامِ جاں کو
قنوج ہوں ،دنیا میں ہے میری شہرت

دارجلنگ بہ زبانِ حال کیا کہہ رہا ہے ملاحظہ فرمائیں:

صناعِ قدرت کا نمونہ ہوں میں
فطرت کا نکھرتا ہوا چہرہ ہوں میں
ہوں بیچ پہاڑوں کے شگفتہ گلزار
شاداب بہاروں کا کرشمہ ہوں میں

''چہرہ نما'' دوسو سے زائد رباعیات کا ایسا خوبصورت مجموعہ ہے جس کی رباعیوں میں کردار نگاری اور مرقع کشی کے بہترین نمونے دکھائی دیتے ہیں۔جن شخصیات پر رباعیاں قلمبند کی گئی ہیں ان کی اہم ترین خصوصیت کو ان رباعیوں میں پیش کیا گیا ہے۔شمس الرحمان فاروقی کے بارے میں کہتے ہیں:

مشرق کے دفینوں پہ نظر ہے ان کی
مغرب کے خزینوں پہ نظر ہے ان کی
رہتے ہیں قدم اپنی زمیں پر لیکن
افلاک کے زینوں پہ نظر ہے ان کی

www.urduacademyts.com

رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری کے متعلق کہا ہے:

حافظؔ کی غزلیات کا تیور کہیے
رومیؔ کی حکایات کا ضو گر کہیے
ٹیگورؔ کے نغماتِ حیات افزا کو
مے خانۂ خیامؔ کا ساغر کہیے

بعض رباعی گو شاعروں نے اگر چہ اس قسم کی چند سوانحی اور مرقع کشی کی حامل رباعیاں کہی ہیں لیکن ایسی رباعیات کا مجموعہ ترتیب دینے کا اعزاز علقمہ شبلی کو حاصل ہے۔ یہی بات ''شہر نامہ'' کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصر حاضر کے رباعی گو شعرا میں علقمہ شبلی کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ علقمہ شبلی کی رباعیاں جہاں فکری اعتبار سے متاثر کن ہیں وہیں فنی پختگی کی بھی مظہر ہیں۔ اسلوب کی دلکشی، زبان کی صفائی، الفاظ کی بندش فکر وخیال کی بہترین ترسیل اور اثر آفرینی کے لحاظ سے علقمہ شبلی کی رباعیاں شاندار اور جاندار ہیں۔ بلا شبہ عصرِ حاضر میں رباعی کے فن کے احیا کرنے اور اسے آب وتاب عطا کرنے والے شعرا میں علقمہ شبلی کا شمار ہوتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول
پروفیسر شعبہ اردو، مہاراشٹرا اُودے گری کالج
اودگیر۔413517 ضلع لاتور (مہاراشٹرا)
موبائل:9028598414

مضامین

حضرت داغؔ دہلوی کی ایک غزل

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

شمع رو آپ گو ہوئے لیکن
لطف سوز و گداز کیا جانیں

کب کسی در کی جبہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

جو رہ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں

پوچھئے مے کشوں سے لطف شراب
یہ مزا پاکباز کیا جانیں

بلے چتون تری غضب ری نگاہ
کیا کریں گے یہ ناز کیا جانیں

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک
وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

حضرت خضر جب شہید نہ ہوں
لطف عمر دراز کیا جانیں

جو گزرتے ہیں داغؔ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

oOo

www.urduacademyts.com

قومی یکجہتی کے فروغ میں اُردو شاعری کا حصّہ

ہندوستان رنگارنگ تہذیب کا گہوارہ ، مختلف قوموں کی آماجگاہ، مختلف لسانی، تہذیبی، نسلی اور مذہبی اکائیوں کا ایک غیر مرئی تاگے میں پرویا ہوا ہار ایک ایسا خوبصورت ملک ہے جس میں ۷۰۰ سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں، ۴۷ سے زائد زبانوں میں اعلیٰ ادب کی تخلیق ہوتی ہے اور جس کی ۱۵ زبانیں قومی سطح پر تسلیم شدہ ہیں۔ آج ہم جس چیز کو بھی ہندوستانی کہتے ہیں چاہے وہ ایک لفظ ہو یا نظریہ، چاہے وہ فنونِ لطیفہ کی کوئی شکل ہو چاہے سیاسی ادارہ ہو یا سماجی و معاشرتی روایت، ہر ہندستانی چیز مختلف النوع عناصر سے مرکب ملے گی۔ ہندوستان میں اختلافات کی کثرت کے باوجود تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمیں ہندوستانی تہذیب کی تعمیر میں ایک نمایاں جذبہ اتحاد پوشیدہ ملتا ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ یہی اندرونی جذبہ اتحاد ہندوستانی تہذیب کا خاص وصف ہے۔ ہندوستان جیسا وسیع وعریض ملک، اتنی کثیر آبادی اور لسانی اور جغرافیائی اختلافات کے باوجود ایک ملک اس لیے کہلاتا ہے کہ اس ملک میں ہندوستانیت کا ایک غیر مرئی احساس پایا جاتا ہے جو انیکتا میں ایکتا پیدا کرتا ہے، رنگارنگی میں یک رنگی کی شان لاتا ہے اور اتفاق و اتحاد کی فضا میں اختلافات کے شعلوں کو بجھا دیتا ہے۔ اسی ہندوستان کی ایک زبان اردو بھی ہے جسے قومی یکجہتی اور رنگارنگ تہذیب کا مظہر سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں کی جارہی ہیں اور ان کوششوں کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ گلاب کے پھول سے اپنی خوشبو کی تعریف کرنے کے لیے کہا جائے اور سورج سے اس کی روشنی کا پتہ دریافت کیا جائے۔

قومی یکجہتی کی کب اور کہاں ضرورت نہیں تھی۔ عالمی ادبیات میں اس کی نشاندہی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں اسے ایک عمرانی نظریے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ایسا عمرانی نظریہ جسے اپنا کر ہی ہم ترقی کی منزلیں طے کرسکتے ہیں۔ ہماری خوش بختی یہ ہے کہ اردو جب ایک زبان کی حیثیت سے وجود میں آئی اور جب یہ زبان ادب کے قالب میں ڈھلی تو یہ قومی یکجہتی سے الگ کوئی چیز نہیں تھی۔ اردو اور یکجہتی کو لازم وملزوم کہا جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

آزادی کے بعد قومی یکجہتی کی اہمیت صحیح معنی میں محسوس کی گئی اور اس کے منتشر عناصر کو مجتمع کرنے کی ضرورت سمجھی گئی۔ ہندوستان کی تہذیبی زندگی کا یہ بدترین المیہ تھا کہ یکجہتی کی علامت اور قومی ہم آہنگی کی علمبردار اس زبان کو سیاسی مصلحتوں کی قربان گاہ پر شہید ہونا پڑا۔ تعصب، تنگ نظری، کوتاہ اندیشی، سیاست کی کرشمہ سازی اور ''جہل خرد'' نے یہ دن دکھائے کہ اردو کو کچھ حلقے ''بدیسی زبان'' کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کی زبان، فرقہ پرستی کی علامت اور

www.urduacademyts.com

ملک کی تقسیم کا سبب قرار دینے لگے۔

سولھویں اور سترھویں صدی اس اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ مقامی زبانوں کے ادب کے ذخیرے میں کافی اضافہ ہوا۔ایک طرف تو فارسی میں دربار سے وابستہ افراد تذکرے وقائع اور تراجم میں مصروف تھے اور مذہبی کتابیں لکھی جارہی تھیں۔ دوسری طرف کبیرؔ، نانکؔ، اور دوسرے صوفی اور بھکتی خیالات سے متاثر شعراء عوامی زبان میں اپنے فلسفیانہ افکار شعر کی زبان میں پیش کررہے تھے۔اس دور میں رحیمؔ، رس کھانؔ، تلسی داسؔ، کیشوؔ، سندر سینا پتیؔ، اور بہاریؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو کی داغ بیل صحیح معنوں میں اُس وقت پڑنا شروع ہوگئی تھی جب یہاں کی مقامی زبانوں پر عربی، فارسی، ترکی، زبان کے اثرات پڑنے لگے تھے۔اس زبان کو ابتداء میں ہر جگہ ہندوی زبان کہا گیا اور اس زبان سے مراد وہی زبان لی جاتی رہی جو باہمی میل جول کا نتیجہ تھی۔

مسعود سعید سلمان کو اس زبان کا سب سے پہلا شاعر سمجھا جاسکتا تھا لیکن ان کا کوئی کلام اب تک دستیاب نہیں ہوسکا۔ امیر خسرو کے ایک شعر اور دوسرے حوالوں میں اس کا اشارہ ملتا ہے کہ انھوں نے ہندی میں کچھ شعر لکھے۔اس سلسلے کی دوسری اہم شخصیت خود امیر خسروؔ ہیں جن کا تذکرہ صوفیوں کے ذیل میں بھی کیا جاچکا ہے۔لیکن امیر خسروؔ سے پہلے حضرت بابا فرید گنج شکر یا شکر گنج (۱۲۷۳ء۔۱۲۶۵ء) کا بہت سا کلام سکھوں کے گروگرنتھ صاحب میں دیا گیا ہے۔۱۳۰ دوہے فرید ثانی کی تصنیف ہیں۔ بہاؤ الدین باجن نے بھی ان کے دوہے درج کیے ہیں اور شیرانیؔ نے ان کی صفت ملمع کی غزل کے پانچ شعر لکھے ہیں۔

گروگرنتھ صاحب میں بہت سے دوہے ایسے ہیں جو عام طور سے پڑھے جاتے ہیں لیکن ان کا انتساب نہیں درج کیا جاتا۔ان میں صرف تیکن لکھے جاتے ہیں۔

کا گا کرنگ ڈھنڈھ لیا، سگلا کھائیا مانس
ایہہ دو نیناں مت چھوئیا پیا دیکھن کی آس
کا گا چونڈ نہ پنجرا بین تو اٹھ جائے
جس پنجرے مرا ساہ بسے تن مانس نہ کھائے
جوبن جائے تو جائے پر پیا کی پریت نہ جائے
دیکھ سکھی اجوبن کتنے، بن پریت کیے کہلائے

فکری سطح پر عشق یا بھگتی کا تصور بھی قومی یکجہتی کے شعور کا لازوال سرمایہ رہا ہے۔عشق جس میں انسانوں کے درمیان منافرت کی ساری دیواریں منہدم ہوجاتی ہیں۔اور جو ہر طرح کے امتیازات اور من وتو، کا فرق مٹا کر ایک نقطہ پر مرتکز ہوجاتا ہے۔عشق کا یہ تصور نامدیو تکارام، گیسو دراز، رامانند، برہان الدین جانم، راما، تلسیؔ، نانکؔ، کبیرؔ، رحیم، رس کھاں اور اکثر مسلمان صوفی سلسلوں کے یہاں نظر آتا ہے۔ مذہبی رسوم اور ظاہری علائق کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔اردو میں تصوف کی تحریک بعینہ یہی رہی ہے۔اور

www.urduacademyts.com

اس طرح یہ بھی دورِ تشکیل میں قومی یکجہتی کا ایک اہم عنصر ہے۔

قلی قطب شاہ نے شمالی ہند میں فارسی شاعری کی اس حسین روایت کو جو قومی یکجہتی کی ایک بڑی علامت تھی' اپنی فارسی شاعری میں سمویا۔

مِرے بت کوں پوچھتے سارے بُتاں
سبھی رمالاں کہو اس کا جواب
خالی ہندو کا کر مجھ کہا ہے بُت پرست
سب خیالاں اپنے سکٹ کرتا ہے میرا خیال بہت

وجہی خالص ہندوستانی تصورات کو اپنانے کے لئے قطب کی راکشش سے لڑائی کرواتا ہے۔ اس کے تین سر اور چار ہاتھ ہیں اور وہ صبح اُٹھ کر نو ہاتھیوں کا ناشتہ کرتا ہے:

صبح اُٹھ نہاری کرے نو ہتی
کہ ملعون، ہے دہ بڑا نکستی

وجہی سے ملتا جلتا دور ابراہیم عادل شاہ کا ہے۔ اُس نے خالص ہندی میں شاعری کی ہے۔ اُس کے گیت ہندوؤں کے دیوتاؤں کی مدح میں ہیں۔ اُس کی نظم نورس، ڈاکٹر تاراچند کے اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ " مسلمانوں کے فلسفیانہ خیالات پر ہندوانہ اثرات کچھ کم اثر انداز نہ تھے۔ نورس نو جذبات کا مجموعہ ہے جو ہندو فلسفے کے اعتبار سے انسان میں پائے جاتے ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ نے اپنے یک سکے 'ہن نورس' پر اپنے نام کے ساتھ 'جگت گرو' کا لقب بھی کندہ کرایا۔

اردو ادب کا بیشتر ابتدائی سرمایہ شاعری پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری اردو نثر سے پہلے ارتقاء پذیر ہوئی اس لئے قومی یکجہتی کے اثرات سب سے زیادہ شاعری میں نمایاں ہیں۔ جہاں مسلمانوں نے ہندو اوتاروں کرشن، رام، ہولی، جنم اشٹمی، راکھی، شیوراتری، دُرگا پوجا، (دیوالی) دسہرہ، گرونانک پر نظمیں لکھیں وہیں ہندو شعراء نے عید، محرم، شب برات، جیسے تہواروں پر نظمیں لکھیں اور پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین پر نظمیں لکھیں۔ سلام اور مرثیے کہے۔ یہ سلسلہ چندو لال دلگیر سے جگن ناتھ آزاد اور آگے جاری ہے۔

اردو ادب میں سب سے پہلے نظیر اکبرآبادی نے اپنی شاعری میں قومی یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ ہندوؤں کا شاید ہی کوئی ایسا تہوار یا اوتار ہوگا جس پر نظیر نے نظم نہ لکھی ہو۔ انھوں نے اپنی ان نظموں کے ذریعے اردو کو قومی یکجہتی کا ایک موثر وسیلہ بنایا۔ اردو شاعری کی ابتداء سے لے کر آج تک کتنے ہی شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے قومی یکجہتی کے گیت گائے ہیں۔ قلی قطب شاہ کے کلام میں ہمیں ہندو مسلم یکجہتی کے اچھے نمونے ملتے ہیں' انھوں نے بسنت کے عنوان سے کئی غزلیں لکھیں۔ جس کی زبان مخلوط ہے۔ ولی اور سراج نے بھی اپنی غزلوں میں فارسی اور ہندی الفاظ کا بہترین استعمال کیا ہے:

سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ
کہ جیوں گل سوں نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

فائز دہلوی نے ہندوستانی ماحول اور جذبات کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ ہندوستانی ماحول سے استعار اخذ کئے ہیں اور مذہبی تہواروں، پیشواؤں، سے متعلق نظمیں

www.urduacademyts.com

کہیں۔ تو میرؔ بھی ان سے پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے اشنانوں، پنگھٹوں اور ہولی وغیرہ تہواروں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

قومی یکجہتی کو حصول آزادی کے لئے ایک بنیادی ضرورت تصور کیا جانے لگا، ادھر انگریزوں کی کوشش کہ ان میں اتحاد پیدا نہ ہوسکے۔ ایسے ماحول میں قومی شعور کو بیدار کرنے میں جہاں اردو اخباروں نے اہم رول ادا کیا وہاں اردو شاعروں اور ادیبوں نے بھی قومیت کے نئے تصور کو فروغ دیا۔ جہاں انھوں نے ہندو مسلمانوں کے اتحاد پر زور دیا وہیں عوام کو متحد ہوکر آزادی کے حصول کی ترغیب بھی دی۔ جس میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ کو اولیت حاصل ہے۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

اقبالؔ کی طرح اس دور کا کوئی شاعر ایسا نہیں تھا جس نے فرقہ پرستی کے خلاف آواز نہ اٹھائی ہو اور ہندوستانیوں کو نفرت کی بجائے اتفاق اور اتحاد کی تلقین نہ کی ہو۔ اکبرؔ، چکبستؔ، سیمابؔ، ظفر علی خاںؔ، نہ جانے اور کتنے نام ہیں جنھوں نے اپنے اپنے طور پر قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے کوشش کی ہیں۔

محرم اور دسہرہ ساتھ ہوگا
نباہ اس کا ہمارے ساتھ ہوگا
(اکبرؔ)

مغلوں کے زمانے میں ہولی کی رنگینیاں محض ہندوؤں تک محدود نہیں تھیں بلکہ مسلمان بھی ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ قلعہ معلیٰ میں بھی ہولی کی تقریب بڑے ذوق وشوق سے منائی جاتی تھی۔ شاہ عالم آفتاب سے متعدد ہولیاں منسوب ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ معلیٰ میں پھاگ گانے، پھاگ کھیلنے اور پھاگ منگوانے کا عام رواج تھا۔

نادرات شاہی کی مختلف ہندی نظمیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عید، بقر عید، آخری چار شنبہ اور عرسوں سے ہولی دیوالی وغیرہ کا اہتمام کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ ان رسومات کا اثر مسلمانوں کے سماجی ادارات پر بھی ہوا۔ مسلمانوں میں شادی بیاہ کے موقع پر ابٹنا کھیلنے کی رسم بہت کچھ ہولی سے ملتی جلتی ہے۔ ہولی کے موقع پر لکھنؤ میں ہندو آج بھی آپس میں گلے ملتے ہیں۔ یہ رواج بہت کچھ عید میں مسلمانوں کے معانقہ کرنے سے ملتا جلتا ہے۔ رنگ پاشی دوادشی کو کہتے ہیں۔ الفاظ گواہی دے رہے ہیں کہ ہندوؤں نے یہ نام مسلمانوں سے حاصل کیا۔

اردو شاعری کے آئینے میں مقامی تیوہاروں کی جو کیفیت نظر آتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ تیوہار محض مذہبی رسوم نہیں بلکہ باہمی میل جول اور معاشرتی ربط ومحبت کے اہم ترین مواقع بھی فراہم کرتے تھے۔ ہندوستان کے تہذیب و تمدن کے دوسرے شعبوں کی طرح یہاں کے تیوہار بھی مختلف رنگوں کا عجیب وغریب مرکب ہے۔ لیکن ان کا تعلق چونکہ خوشی اور فراغت کے ان فطری جذبات سے ہے جو یہاں کے زمین

www.urduacademyts.com

وآسمان اورآب وہوا کے اثر سے طبیعت میں پیدا ہوتے ہیں، یہاں کے تمام باشندے ان تیوہاروں سے گہرے طور پر متاثر ہوتے ہیں۔جس طرح مسلمان ہندوؤں کے تیوہاروں میں شریک ہوتے ہیں ویسے ہی ہندو بھی مسلمانوں کی تقاریب میں شامل ہوکر حق اخلاص ادا کرتے ہیں۔

اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے سرسری جائزے سے ہم بہ آسانی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ازابتداء تا حال اردو شاعری نے نہ صرف مختلف صنفی پیکروں، سانچوں، طریقوں، زاویوں سے بلکہ انسانیت کے ہر پہلو سے ہندوستانیوں کو یکجہتی اتفاق و اتحاد اور بھائی چارے کی تعلیم دی ہے۔قدیم شعراء سے لے کر شعرائے جدید تک بلا تفریق مذہب و مسلک و ذات و شخصیت، رتبے و حیثیت وطن دوستی اور یکجہتی کے جذبے کو پروان چڑھانے اور فروغ دینے میں ہمہ تن لگے رہے۔انھوں نے اپنی شاعری و نظموں میں ہندوستانیت و طنیت، قومیت اور یکجہتی کے ہر پہلو کو دکھانے، برتنے اور نبھانے ہم آہنگی و بھائی چارے کے جذبے کو ہر ہندوستانی کے دل میں ابھارنے اور اس گنگا جمنی تہذیب و مشترکہ وراثت کو سنبھالنے، قائم رکھنے اور مل کر اس کی حفاظت کرنے کا جو سبق اردو شاعری کے وسیلے سے دیا ہے وہ ہر لحاظ سے دلنشیں، قابلِ ستائش، مسلم و مستحکم ہے۔اہل نظر خود بھی اس کی قدر و قیمت آنک سکتے ہیں کہ اردو یکجہتی کے جذبے کی نگہدار و ترجمان ہے۔

حوالہ جاتی کتب:۔

۱۔اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر، سید مجاور حسین، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۵ء
۲۔ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، گوپی چند نارنگ، مختلف جلدیں۔
۳۔ شعاع ادب (حصّہ اوّل)، ڈاکٹر سمیع اللہ، تفسا کمپیوٹرز، پرنٹر اینڈ پبلیشرز کیمپ امراؤتی۔
۴۔قومی یکجہتی اور اردو شاعری، ڈاکٹر ایم اظہر حیات، یشوداگرلز آرٹس اینڈ کامرس کالج، ناگپور، ۲۰۱۱ء
۵۔اردو شاعری میں قومی یکجہتی وہم آہنگی کے رجحانات، ڈاکٹر عبدالستار، لوک نایک کالج، ایوت محل، ۲۰۱۳ء
۶۔اردو شاعری میں قومی یک جہتی کی روایت، ڈاکٹر رام آسرا رازؔ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۷۷ء
۷۔ ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایت، بی۔ایس۔ پانڈے، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۴ء
۸۔ہندوستان میں قومی یک جہتی کی روایات، ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے، فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، اتر پردیش لکھنو، ۱۹۸۶ء

☆☆☆

ڈاکٹر محمد راغب محمد طالب دیشمکھ
اسوسی ایٹ پروفیسر
صدر شعبۂ اردو، جی ایس سائنس، آرٹس اینڈ کامرس، کالج
کھام گاؤں ضلع بلڈانہ (مہاراشٹر)
موبائل 09422926544

مضامین

www.urduacademyts.com

جے۔پی سعید کی شاعری کا فنی تجزیہ

("گل گشت" اور "شاخ گل" کے حوالے سے)

دکن کا علاقہ از منہ قدیم ہی سے شعرا و ادبا کے لیے زرخیز ثابت ہوا ہے۔ ماضی میں مراٹھواڑہ سے جن شعرائے کرام نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا، ان میں ولی، سراج، حمید، داؤد، سکندر علی وجد کے بعد بلاشبہ علامہ جے۔پی سعید کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جے۔پی سعید کے ذکر کے بغیر اورنگ آباد کی تاریخ مرتب ہو یہ ممکن نہیں۔ ہم انھیں مراٹھواڑے کے شعرا کا امام مان لیں تو یہ ان ادب نواز و سخن پرور ہستی کے حق میں حقیقی خراج تحسین متصور ہوگا۔

جے۔پی سعید کا نام ایک درخشاں ستارے کی مانند منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے حامل انسان تھے۔ دنیا انھیں ایک عظیم معلم مستزاد کہنہ مشق استاذ شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ آج ہم اسی روحِ سعید دکن کی شخصیت اور ان کی شاعری سے متعلق گفتگو کریں گے کہ جس نے اپنے افکار بلیغ کو اپنی شعری تخلیقات میں جمع کر دیا ہے، ان کے مطالعے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ واقعی شاعری خونِ جگر کی متقاضی ہوتی ہے۔

جے۔پی سعید کی شاعری محض لفظوں کی شاعری نہیں بلکہ جذبات کی شاعری ہے۔ انھوں نے جو محسوس کیا رقم کیا، جو ان پر گزری وہ بیان کیا، جو سوچا تحریر کیا، ان کی شاعری تصنع سے عاری، تملق سے ماوریٰ اور ریا سے مبریٰ قرار پاتی ہے، خالص جذبات کے موتی ہیں کہ گردونِ فکر سے ٹپک پڑتے ہیں، ایک رودِ مسلسل ہے کہ دل و دماغ کو سیراب کرتی ہے، عشق و سرمستی کی وہ باتیں کہ جو شاعری کی اساس کہلاتی ہیں، ان کی شاعری میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ انھیں گفتگو کا قرینہ اور اظہار محبت کا سلیقہ خوب آتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کے خیال میں جے۔پی سعید کا تاثر ان کی کتاب گل گشت کے حوالے سے یوں ملتا ہے:

"سعید غزل کے شاعر ہیں اور میں نے ان کی غزلیات کا مسودہ اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ مجھے سعید صاحب کے تغزل کی تازگی اور شگفتگی نے قدم قدم پر متاثر کیا ہے۔" (گل گشت، ص۹)

جے۔پی سعید نے غزل کو اپنے مانوس و دل کش تغزل نیز روایت کی پاس داری کے ساتھ زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کیا خوب کہا ہے:

"اِس دور میں جب کہ جدیدیت کے نام پر اصلاحی جدیدیت یا نام نہاد جدیدیت طرح طرح کے بدرنگ لباس پہن کر ہمارے سامنے آرہی ہے سعید صاحب روایت اور جدیدیت کا ایک ایسا حسین امتزاج اپنی شاعری میں پیش کررہے ہیں جو اندھیرے میں چراغ کی طرح جل رہا ہے۔" (گل گشت، ص۹)

اس مضمون میں خاکسار نے علامہ جے۔پی سعید کے کلام کو علم البیان کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے کہ علم بیان وہ علم ہے کہ جس سے بات کو نت نئے طریقوں

www.urduacademyts.com

سے کہنے کا قرینہ آ جائے، اس طرح کلام میں زور اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ چناں چہ جے۔ پی سعیؔد کی شاعری میں تشبیہ کی مثالیں ملتی ہیں:۔

اس کی شوخی جیسے غالبؔ کی غزل
اس کے تیور جیسے مومنؔ کا کلام
(گل گشت، ص۲۹)

مذکورہ شعر میں شاعر اپنے معشوق کی شوخی کو مرزا غالبؔ کی غزل اور اس کے تیور کو مومن خاں مومنؔ کی شاعری سے تشبیہ دے رہا ہے۔ سعیؔد کے پاس استعارے کی مثال یوں ملتی ہے۔

روکھی سوکھی پہ سدا عمر بسر کی ہم نے
اپنی تقدیر میں سونے کا نوالا کب تھا
(شاخ گل، ص۱۸)

اس شعر میں ''سونے کا نوالا'' کہہ کر تونگری مراد لی گئی ہے۔ ''سونے کا نوالا'' کے لغوی اور معنوی معنوں میں تشبیہی تعلق پایا جاتا ہے جو استعارے کے لیے از حد ضروری ہے۔

جے۔ پی سعیؔد کے کلام کا جائزہ لیں تو ہمیں ان کے کلام میں، شعری تجربات کے جمالیاتی اظہار کے لیے مختلف پیکر تراشے ہوئے ملیں گے، جن میں متحرک پیکر، خیالی پیکر، روشنی کے پیکر، آتشیں پیکر، رنگیں پیکر، سمعی پیکر، بصری پیکر، لمسی پیکر، پیکر شامہ، پیکر ذائقہ وغیرہ ملتے ہیں، جن سے ان کے لاشعور میں نہاں جذبۂ حرکت مستزاد رنگ و نور سے ان کی وابستگی کا پتا چلتا ہے۔ دیگر شعرائے کرام کی طرح جے۔ پی سعیؔد نے بھی اپنے کلام کو صرف شعری وزن اور دیگر ضروریاتِ شعری ہی سے آراستہ نہیں کیا بلکہ لفظی اور معنوی خوبیوں کے ذریعے شعر میں حسن پیدا کرنے کی زبردست کوشش کی ہے۔ اشعار میں حسن اور جدت پیدا کرنے کے اس طریقے کو ہم اصطلاح میں صنائع و بدائع کا نام دیتے ہیں۔ جے۔ پی سعیؔد کے کلام میں صنائع لفظی کی مثالیں اس طرح ملیں گی۔

شعر میں ایسے دو الفاظ لائے جائیں جن کا تلفظ ایک ہو لیکن معنی مختلف ہوں تو اسے ''صنعت تجنیس تام'' کہتے ہیں۔ مثال دیکھیے۔

یہ کسی نے تم سے غلط کہا مجھے کارواں کی تلاش ہے
جہاں میں ہوں، تم ہو، کوئی نہ ہو، مجھے اس جہاں کی تلاش ہے
(گل گشت، ص۹۴)

شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ ''جہاں'' دو مرتبہ آیا ہے۔ پہلی بار اسم اشارہ کے طور پر اور دوسری مرتبہ لفظ ''جہاں'' دنیا کے معنی میں مستعمل ہے۔ اسی طرح دو ایسے الفاظ استعمال کرنا جو لکھنے میں یکساں ہوں لیکن ان کی حرکت میں فرق ہو تو ''صنعت تجنیس ناقص'' کہیں گے، اس کی مثال کے لیے سعیؔد کا یہ شعر دیکھیے۔

محبت کا مزہ جب ہے کہ ملتے ہی نگاہوں کے
اِدھر اقبال ہو جائے اُدھر ایجاب ہو جائے
(شاخ گل، ص۲۳)

شعر کے دوسرے مصرعے میں اِدھر اور اُدھر میں حرکت کا لحاظ نہ کیا جائے تو شعر کا وقار مجروح ہوگا۔ ''صنعت تجنیس زائد'' کو سمجھنے کے لیے جے۔ پی سعیؔد کے اس شعر پر غور کیجیے۔

www.urduacademyts.com

مدت کے بعد ہم پہ ہوا اس کا انکشاف
طالب تھے جس کے ہم وہ ہماری طلب میں تھا
(شاخ گل،ص ۲۰)

مذکورہ شعر کے دوسرے مصرعے میں ''طالب'' اور ''طلب'' کے مابین ایک حرف کا فرق پایا جاتا ہے اور یہ فرق درمیان میں ملتا ہے۔ کلام میں ایسے دو لفظ لانا جن کے ایک لفظ میں دو حرف زائد ہوں تو ''صنعت تجنیس مزیل'' قرار پائے گی۔ مثال دیکھیے ۔

بے وفا نکلے وہی جن سے وفا آپ نے کی
آپ کس دن مرے ایثار کے قائل ہوں گے
(شاخ گل،ص ۳۱)

شعر میں ''بے وفا'' کے پانچ اور ''وفا'' کے تین حرف ہیں۔اس طرح ''بے وفا'' کے دو حرف زائد ہیں۔لفظوں کی تکرار کی وجہ سے اصوات کی تکرار ہوکر شعر میں نغمگی پیدا ہوتی ہے۔پی سعید کے کلام میں تجنیس تکرار کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

بہار اوج پہ اور طبعِ باغباں رنگیں
روش روش ہے اِرَم صحن گلستاں رنگیں
(گل گشت،ص ۳۳)

درج بالا شعر میں ''روش روش'' تجنیس تکرار کی مثال ہے ۔شعر میں ایسے الفاظ لانا جن میں دو قافیے ہوں۔''صنعت ذوقافیتین'' کہتے ہیں۔جیسے ۔

یہ بازارِ محبت ہے یہاں نفرت نہیں ملتی
جہاں خورشید ہوتا ہے وہاں ظلمت نہیں ملتی
(شاخ گل،ص ۲۲)

اوپر کے شعر میں قافیے ''نفرت'' اور ''ظلمت'' سے پہلے مزید قافیے ''یہاں'' اور ''وہاں'' آئے ہیں جن کے حرف روی یکساں ہیں۔ایسا شعر جو دو زبانوں میں پڑھا جائے۔''صنعت ذولسانین'' کہتے ہیں۔جیسے۔

داعیٔ احکام حق مرجعِ پیر و جواں
حامیٔ دینِ خدا راہ برِ اِنس و جاں
(شاخ گل،ص ۱۱۶)

مذکورہ شعر کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں پڑھا جاسکتا ہے۔اس کے برخلاف جب شعر کا ایک مصرع ایک زبان میں اور دوسرا مصرع کسی اور زبان میں ہوتو ''صنعت تلمیع'' قائم ہوتی ہے۔جیسے۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کوئی کمرے کے اندر بولتا ہے
(شاخ گل،ص ۱۱۶)

مذکورہ شعر کا پہلا مصرع فارسی زبان میں ہے جب کہ دوسرا مصرع خالص اردو ہے۔''صنعت رقطا'' اس وقت واقع ہوتی ہے جب کہ نظم کے الفاظ میں ایک حرف بے نقطہ اور ایک حرف نقطہ دار ہو۔جیسے۔

رکھ کے سر سوتا ہوں جب زانوئے مادر پہ سعیدؔ
بادشاہوں کی سعادت کا مزا آتا ہے
(شاخ گل،ص ۱۹)

اوپر کے شعر میں کہیں بھی دو منقوط حرف ایک ساتھ نہیں ملتے۔اسی طرح وہ صنعت شعری جس سے کلام میں اعداد کا ذکر پایا جاتا ہو اور اس میں ترتیب وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی، ایسی صنعت کو ''صنعت سیاقتہ الاعداد'' کہتے ہیں۔جیسے ۔

www.urduacademyts.com

بجا ہے ترک تعلق مگر گزارش ہے
کہ مشورہ تو کریں آپ چار سے پہلے
(ایضاً، ص ۳۰)

شعر میں لفظ ''چار'' کا استعمال صنعت سیاقتہ الاعداد کی مثال ہے۔ اگر کلام میں کسی چیز یا فرد کی متعدد اور مسلسل خوبیاں بیان کی جائیں تو اسے ''صنعت تنسیق الصفات'' کہتے ہیں۔ جیسے ؂

زلف، ابرو، چشم، عارض، لب، دہن
ایک نازک آرزو اور اتنے دام

مذکورہ شعر میں ایک آرزو کے لیے متعدد خوبیاں مصرعۂ اولیٰ میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے برعکس صنعت اشتقاق یعنی ایک مصدر سے کئی الفاظ بنانا۔ جے۔ پی سعید کے ہاں اس کی مثال دیکھیے ۔؂

یوں دھڑ کتے ہوئے دل سے وہ لفافہ کھولا
دل مرا اس میں ہے ملفوف کہ خط کا کاغذ
(گل گشت، ص ۱۲۱)

پہلے مصرعے میں لفافہ اور دوسرے میں ملفوف ایک اصل (مادّے) سے مشتق ہیں۔

شعر میں دونوں مصرعوں کے تمام الفاظ علی الترتیب ایک دوسرے کے ہم وزن ہوں تو ''صنعت ترصیع'' قائم ہوتی ہے۔ جیسے ؂

تو مالکِ شمس و قمر
تو مالکِ جن و بشر
(گل گشت، ص ۲۱)

مذکورہ شعر نہ صرف ہم وزن بلکہ ہم قافیہ بھی ہے۔ جب کہ شعر میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں تو اس کو ''صنعتِ تضاد یا صنعتِ طِباق'' کہتے ہیں۔ جیسے ؂

اگر ہے آج جدائی تو کل ملن ہوگا
چمن میں آتی ہے پت جھڑ بہار سے پہلے
(شاخ گل، ص ۳۰)

شعر میں ''آج'' اور ''کل'' کے علاوہ ''پت جھڑ'' کے بعد ''بہار'' جیسے الفاظ آئے ہیں، یہی صنعت تضاد ہے۔ کلام میں کسی چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ''صنعت مبالغہ'' کہلاتا ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔ (ا) تبلیغ (ب) اِغراق (ج) غُلُو۔

وہ مبالغہ جو عقل اور عادت دونوں کے قریب ہو ''تبلیغ'' کہلائے گا۔؂

ہزاروں میں کوئی ہوتا ہے بختاور زمانے میں
بنے مٹی سے سونا، سب کی یہ قسمت نہیں ہوتی
(شاخ گل، ص ۲۲)

مٹی سے سونا بننا قسمت چمکنے کے معنی میں مستعمل ہے اور یہ قسمت ہزاروں میں کسی کسی کی چمکتی ہے۔ نیز مبالغے کی وہ بات جس کو عقل تو قبول کرتی ہو لیکن عادتاً ایسا نہ ہو ''اِغراق'' کہتے ہیں۔ جیسے ؂

مرے وطن کے سبھی لوگ چاند تارے ہیں
زمین اس کی مجھے جیسے آسماں ہی لگے
(شاخ گل، ص ۳۴)

ہم وطنوں کا چاند تارے کہلانا عقل تو تسلیم کرتی ہے لیکن یہ عادتاً ممکن نہیں۔ اسی طرح وہ بات جو عقلاً اور عادتاً دونوں اعتبار سے ناممکن ہو، ایسی صورت کو ''غُلُو'' کہتے ہیں۔ جیسے۔؂

www.urduacademyts.com

ہم نے موتی لٹائے اشکوں کے
چاند تاروں کی جب برات آئی
(شاخ گل،ص ۴۱)

''موتی لٹانا'' اور'' چاند تاروں کی برات آنا'' صرف محاورۃً مستعمل ہے۔ یہ نہ تو عقلاً ممکن ہے اور نہ عادتاً، اس اعتبار سے یہ کیفیت غلو کہلاتی ہے۔

کلام میں کسی مشہور واقعے یا کسی مذہبی روایت کی طرف اشارہ کرنے کو'' تلمیح'' کہتے ہیں۔ یہ شعر میں کفایتِ لفظی اور ایمائیت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔مثال دیکھیے ۔

زمیں پر معجزے سب انبیا نے اپنے دکھلائے
فلک پر معجزہ سرکارؐ کا شق القمر بھی ہے
(شاخ گل،ص ۱۳)

علامہ جے۔ پی سعیدؔ کے کلام میں صنائع لفظی اور صنائع معنوی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں اختصار کے پیش نظر بہت کم صنعتوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے مستزاد موصوف کے شعری مجموعوں سے مثال بھی ایک ایک ہی دی گئی ہے۔امید کہ راقم کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد انورالدین
اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ ڈگری کالج برائے نسواں' گولکنڈہ'
حیدرآباد 500 008

تربوز موسم گرما کا پسندیدہ پھل

تربوز میٹھا،رس داراور صحت بخش پھل ہے۔گرمی کے موسم میں یہ کسی نعمت سے کم نہیں۔تربوز نہ صرف گرمی کی شدت کو کم کرتا ہے، بلکہ جسم میں پانی کی کمی کو بھی دور کر دیتا ہے،اس لئے کہ اس کے گودے میں پانی زیادہ ہوتا ہے۔تربوز جسم کو ٹھنڈک فراہم کرتا،جلد کی صفائی کرتا اور چہرے کے داغ دھبے بھی دور کر دیتا ہے۔تربوز موسم گرما کی شدت اورلُو کے اثرات سے بچاتا ہے۔یہ چونکہ پیشاب آور پھل ہے،اس لئے یہ گردے اور مثانے کی پتھریوں کو خارج کر دیتا ہے۔تربوز چکنائی سے بالکل پاک اور حیاتین (وٹامن)، ریشے(فائبر)اور سوڈیم سے مالا مال ہوتا ہے۔یہ قبض ختم کرنے میں مفید پھل ہے۔ گرمی کے موسم میں چند دن روزانہ تربوز کھایا جائے تو قبض کی شکایت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔یہ ہاضمے کو بہتر کرتا ہے۔تربوز گردوں کی گرمی کو دور کرتا،دل کو راحت وتسکین دیتا، پیاس کی شدت کو کم کرتا اور بھوک بڑھاتا ہے۔تربوز خون کو پتلا کرتا ہے۔اس کے علاوہ یہ جسم میں نیا خون بھی پیدا کرتا ہے۔بواسیر میں مبتلا افراد کے لئے تربوز بے حد فائدہ مند پھل ہے۔تربوز قدرتی گلوکوس ہے، یہ جسم کو توانائی بخشتا اور گلوکوس کی مقدار میں اضافہ کرتا ہے۔تربوز ہائی بلڈ پریشر اور لو بلڈ پریشر دونوں طرح کے مریضوں کے لئے بھی مفید ہے۔تربوز کو کھانا کھانے کے فوراً بعد یا کھانا کھانے سے فوراً پہلے نہیں کھانا چاہیے،ورنہ بدہضمی اور اسہال (دست) کی شکایت ہوسکتی ہے۔اس لئے تربوز کھانا کھانے کے دو تین گھنٹے بعد کھانا چاہیے۔

oOo

www.urduacademyts.com

پریم چند کے خطوط' ادب اور زندگی کی تعبیر

پریم چند ،فکشن نگار تھے ،انشائیہ نگار نہیں ،سادہ سلیس اور عام فہم اسلوب ان کی نثر کی پہچان ہے۔گرچہ اپنے افسانوں اور ناولوں کی طرح اپنے خطوط میں بھی کہیں کہیں تشبیہ واستعارے کا استعمال کر کے اپنی نثر میں ہلکی ہلکی شعری فضا بھی قائم کی ہے۔لیکن بحیثیت مجموعی جب ہم پریم چند کے خطوط کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کہانیوں کی طرح ان کے خطوط بھی براہِ راست قاری کے دل میں اتر جانے کی خوبی رکھتے ہیں ۔اردو میں خطوط نگاری (مکتوب نگاری) کا ذکر آتے ہی ذہن مرزا غالبؔ اور مولانا ابوالکلام کے خطوط کی طرف جاتا ہے ۔لیکن یاد رہے جس طرح مرزا غالبؔ کی زبان دانی کی جڑیں فارسی میں گہرائی سے پیوست تھیں اور اس پر غالبؔ کو فخر بھی تھا۔اسی طرح مولانا آزاد کی مادری زبان عربی تھی ،فارسی پر عبور تھا اور اردو کی لسانی ،ادبی اور تہذیبی ساخت کے شناور تھے لیکن پریم چند اردو اور ہندی کے قلم کار تھے اور وہ ادب اور صحافت میں ،''ہندوستانی'' کے حامی تھے ۔اس لئے لازمی ہے کہ پریم چند کے خطوط کا مطالعہ غالبؔ اور آزاد کے خطوط کی نثر کے معیار سے الگ ہٹ کر کیا جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ پریم چند بنارس کے مضافات میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں ''لمہی'' کے ایک عام سے نچلے متوسط گھرانے میں ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے ۔اصل نام دھنپت رائے تھا۔ چونکہ سرکاری اسکول میں مدرس تھے' حکومت انگریزوں کی تھی ،اظہار رائے پر پابندی تھی ،اس لئے پریم چند ابتدا میں نواب رائے کے فرضی نام سے لکھتے رہے اور جب ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تو پھر پریم چند کا قلمی نام اختیار کیا۔ کیوں کہ پریم چند ''کائستھ'' تھے اور اس زمانے میں ہر کائستھ کو منشی کہا جاتا تھا اس لئے ادب اور صحافت کی دنیا میں پریم چند کو بھی منشی پریم چند کے نام سے شہرت ملی۔

پریم چند ایک معروف اور معتبر فکشن نگار تو تھے ہی ایک شریف النفس اور سادہ لوح انسان بھی تھے۔اخبارات و رسائل کے مدیران ،دوست احباب ،قومی رہنماؤں ،رشتہ داروں ،معاصر ادیبوں ،صحافیوں اور نیاز مند قارئین کے نام انہوں نے سینکڑوں خطوط لکھے۔ پریم چند کے یہ خطوط برصغیر کی مختلف شخصیتوں اور اداروں کے پاس بکھرے پڑے تھے۔ انہیں حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔لیکن ہندی کے مشہور ادیب شری مدن گوپال نے بڑی محنت ومشقت کے بعد جہاں تک ممکن ہو سکا ان کے زیادہ سے زیادہ خطوط حاصل کر کے انہیں ۱۹۶۷ء میں ترتیب دے کر شائع کر دیا۔ایک عرصہ بعد اردو کے مشہور ومعتبر اشاعتی ادارہ ''مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی'' نے ۲۰۱۱ء ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' دہلی کے اشتراک سے ان خطوط کو ''پریم چند کے خطوط'' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔اس کتاب کے پیش لفظ میں ،مرتب شری مدن گوپال نے پریم چند کے خطوط کے حصول کی دشواریوں کا

www.urduacademyts.com

تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''منشی پریم چند کے خطوط جمع کرنے کی کہانی بڑی دلچسپ ہے ..... اس سلسلے میں مجھے کئی بار لاہور سے بنارس، کانپور، گورکھپور، الہ آباد، دہلی مدارس اور بمبئی کا سفر کرنا پڑا۔ سب سے پہلے مجھے وہ خط ملے جو پریم چند نے اپنے قریبی دوست ماہنامہ ''زمانہ'' کے ایڈیٹر دیانرائن نگم کو لکھے تھے۔ دیا نرائن نگم نے مجھے بچپن کے خط دئے.... اس قیمتی ذخیرے میں پریم چند کا پہلا خط ۱۹۰۵ء کا اور آخری خط ۱۵ اگست ۱۹۳۶ء مجھے ملا۔ اس کے بعد ''کہکشاں'' کے ایڈیٹر امتیاز علی تاج کے نام پریم چند کے ۴۵ خط دستیاب ہوئے..... جیتندر کمار کے نام وہ چوون ۵۴ خط ملے جن کا تعلق پریم چند کی زندگی کے آخری دور سے ہے۔ رگھوپتی سہائے فراقؔ اور ان کے ہم عصر دوسرے شاعروں اور ادیبوں کو بھی پریم چند کے انتہائی ادبی اہمیت کے حامل خط موصول ہوئے، لیکن ان حضرات نے ان خطوں کو محفوظ نہ رکھا۔ یہ خط جمع کرنے کے سلسلے میں جن مشاہیر سے رابطہ قائم کیا گیا ان میں اگر ایک طرف مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد تھے تو دوسری طرف بنارسی داس چترویدی، جئے شنکر پرشاد کے فرزند، اوپندر ناتھ اشک، وشنو پربھاکر، مانک لال جوشی، اندر ناتھ مدان اور ٹوکیو کے کیشورام سبھروال جیسے مصنفین، درگا سہائے سرور کے اہل خاندان اور کچھ ناشرین کے بھی شامل تھے.... پریم چند کے سوتیلے بھائی مہتاب رائے نے مجھے سات خط دئے۔ شیورانی دیوی (پریم چند کی اہلیہ) نے کہا کہ، ان کے پاس جو خط تھے وہ انہوں نے اپنی کتاب ''پریم چند گھر میں'' میں شائع کر دئے ہیں۔ پریم چند کے لڑکوں نے بھی کوئی خط محفوظ نہیں رکھا۔ پریم چند کے بڑے لڑکے شری پت رائے نے مجھے ۱۹۴۳ء میں مجھے لکھا کہ پریم چند کے خطوں کو جمع کرنا پورے وقت کا کام ہے اور اسے وہی انجام دے سکتا ہے جو خود کو اس کے لئے وقف کرلیا گر کوئی اس کام کا ذمہ لے تو میں اس کو معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کے ایک مشن کے طور پر اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور جس کسی سے، جہاں کہیں ملے پریم چند کے خط جمع کئے''۔

(پریم چند کے خطوط، از مدن گوپال۔ ص۔ ۵، ۶)

خط کسی کا بھی کیوں نہ ہو، اس میں لکھنے والے کے ذاتی معاملات، حالات و کیفیات کا بے تکلفانہ اظہار لازمی طور پر ہوتا ہی ہے۔ غالبؔ، آزاد، شبلی اور اقبال تمام مشاہیر کے خطوط میں ادبیت تو اپنے اپنے معیار سے ہے ہی ساتھ ہی ان کی شخصیت، مزاج اور معیار کے آثار اور شواہد بھی ملتے ہیں۔ غالبؔ نے قرض کی پینے اور فاقہ مستی کا ذکر تو کیا ہے لیکن وہ آزاد منش انسان تھے کچھ نہ کر کے بھی زندگی عیش سے ہی گزاری۔ مولانا آزاد تنگ دست نہ تھے لیکن سیاسی سرگرمیوں کے سبب زندگی کا ایک بڑا حصّہ قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے گزارا۔ علامہ اقبالؔ کی زندگی اور شاعری کا مقصد ہی قوم کی فلاح و ترقی تھا۔ ان کے برعکس پریم چند نے غربت میں آنکھیں کھولیں اور کبھی ''ہنس''، کبھی ''سرسوتی'' اور ''جاگرن''

www.urduacademyts.com

کی ادارت کی، اپنا پریس بھی کھولا اور بمبئی جا کر فلمی دنیا میں بھی قسمت آزمائی کی لیکن غربت اور مالی پریشانیوں نے کبھی پیچھا نہ چھوڑا اور آخر کار ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اردو کا یہ بے مثل فکشن نگار اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

ایک درجن سے زائد ناولوں اور تقریباً تین سو افسانوں کے خالق پریم چند نے اردو زبان کے مسائل اور ناول اور افسانہ کے حوالے سے درجنوں مضامین بھی لکھے جنہیں برسوں پہلے کتابی شکل میں پروفیسر قمر رئیس نے شائع بھی کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے اپنی کتاب ''اردو فکشن کی تنقید'' میں پریم چند کی افسانوی تنقید کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ لیکن پریم چند کی مکتوب نگاری کا ابھی تک کم ہی لوگوں نے قلم اٹھایا ہے۔ لہذا میں نے اپنے اس مضمون میں اختصار کے ساتھ پریم چند کی مکتوب نگاری کے بعض اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی کوشش کی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ پریم چند کے جتنے بھی خطوط دستیاب ہیں ان سب پر انہوں نے ''دھنپت رائے'' کے نام سے دستخط کئے ہیں۔

'زمانہ' کے اڈیٹر دیانرائن نگم پریم چند کے بے تکلف دوست ہی نہ تھے غم خوار اور غم گسار بھی تھے۔ اسی لئے پریم چند خط لکھ کر انہیں اپنے رنج و غم میں شریک بھی کرتے تھے۔ مثلاً دیانرائن نگم کے نام مئی ۱۹۰۶ء کے اپنے خط میں بڑی بے تکلفی سے اپنے دکھ درد کا رونا اس طرح رویا ہے،

''برادرم!

اپنی بیتی کس سے کہوں؟ ضبط کئے کئے کوفت ہو رہی ہے، جوں توں کر کے ایک عشرہ کاٹا تھا کہ خانگی تر ددات کا تانتا بندھا۔ عورتوں نے ایک دوسرے کو جلی کٹی سنائی۔ ہماری مخدومہ نے جل بھن کر گلے میں پھانسی لگائی۔ ماں نے آدھی رات کو بھانپا، دوڑیں، اس کو رہا کیا، صبح ہوئی، میں نے خبر پائی، جھلایا، بگڑا، لعنت ملامت کی۔ بیوی صاحبہ نے اب ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی، میکے جاؤں گی۔ میرے پاس روپیہ نہ، ناچار کھیت کا منافع وصول کیا، ان کی رخصتی کی تیاری کی وہ رودھو کر چلی گئیں۔ میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا..... میں ان سے پہلے ہی خوش نہ تھا اب تو صورت ہی سے بیزار ہوں۔'' (پریم چند کے خطوط، ص۔۳۲)

پریم چند نے یہ خط جن دنوں لکھا تھا، ان دنوں وہ سرکاری ملازم تھے اور پابندی کی وجہ سے نواب رائے کے فرضی نام سے لکھا کرتے تھے اور بقول پریم چند ان دنوں ''میں کوئی مضمون خواہ کسی موضوع پر، ہاتھی دانت پر ہی کیوں نہ لکھوں مجھے پہلے جناب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑے گا اور مجھے چھٹے چھ ماہے لکھنا نہیں یہ تو میرا روز کا دھندہ ٹھہرا۔ لیکن ہر ماہ ایک مضمون صاحب والا کی خدمت مین پہنچے گا تو وہ سمجھیں گے، میں اپنے فرائض سرکاری میں خیانت کرتا ہوں اور کام میرے سر تھوپا جائے گا' اس لئے کچھ دنوں کے لئے نواب رائے مرحوم ہوئے، ان کے جانشین کوئی اور ہونگے''۔ (پریم چند کے خطوط، ص۔۳۶)

پریم چند پانچ چھے برسوں تک اپنے ابتدائی افسانے اور ناول لکھتے رہے۔ ان کی تحریریں مقبول بھی ہوئیں

www.urduacademyts.com

لیکن ۱۹۱۰ء تک آتے آتے پریم چند نے نواب رائے کا نقاب اتار دیا اور نگم صاحب کے مشورے پر ہی پریم چند کا قلمی نام اختیار کیا۔ ان سارے حقائق کا اندازہ دیا نارائن نگم کے نام پر پریم چند کے ستمبر ۱۹۱۰ء کے اس خط سے ہوتا ہے۔

''برادرم

میں نے ''وکرمادت کا تیغہ'' ایک قصہ لکھنا شروع کیا ہے .... جلدی ہی ختم کر کے بھیجوں گا۔ پریم چند اچھا نام ہے، مجھے بھی پسند ہے، افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سالوں میں نواب رائے کو فروغ دینے میں جو محنت کی گئی وہ اکارت ہوگئی... میں نے رابندر ناتھ (ٹیگور) کے طرز کی کامیابی کے ساتھ پیروی کی ہے مگر نری نقل نہیں ہے۔ پلاٹ بالکل اوریجنل ہے''۔ (صفحہ ۳۹)

پریم چند کے خطوط سے ان کی حیات اور ادبی خدمات کے وہ پہلو سامنے آتے ہیں جن سے عام قارئین آگاہ نہیں ہیں لیکن جن کی واقفیت ہونے پر پریم چند کو ان کے کل totality میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کیوں کہ پریم چند نے اپنے خطوط میں، اپنے افسانوں، ناولوں، مضامین، اپنے رسالوں، ہنس اور سرسوتی کے بارے میں اندر کی بات کی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً اڈیٹر ''نیرنگ خیال'' کے نام فروری ۱۹۳۴ء کے اپنے خط میں پریم چند نے اپنے فن کے بارے میں لکھا ہے:

''میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ محض واقعہ کے بیان کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا، زمین تیار ہونے پر میں کریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعے سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں لیکن کوئی واقع افسانہ نہیں ہوتا، تا وقت یہ کہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے .... میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پر لطف واقع پر رکھوں... کوئی واقع محض لچھے دار اور چست عبارت میں لکھنے اور انشائیہ پردازانہ کمالات کی بنا پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں افسانے کے لئے کلائمیکس کو لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی''۔

(پریم چند کے خطوط۔ ص۔۳۰۲)

اس طرح ہندی ادیب اندر ناتھ مدام کے نام ۲۶ دسمبر ۱۹۳۴ء کے اپنے خط میں ان کے بعض سوالوں کا ترتیب وار جواب دیتے ہوئے پریم چند نے اپنے ادب اور تخلیقی عمل کے بارے میں لکھا ہے۔

۱۔ رنگ بومی (میدان عمل) میرے خیال میں میری تمام تصانیف میں بہترین ہے۔

۲۔ میرے ہر ناول میں ایک معیاری کردار ہوتا ہے جس میں انسانی صفات بھی ہوتی ہے اور کمزوریاں بھی۔ مگر ان کا معیار ہونا ضروری ہے۔

۳۔ میرے افسانوں کی کل تعداد لگ بھگ ۲۵۰ ہے۔

۴۔ بیشک ٹالسٹائی، ویکٹر ہیوگو اور روماں رولاں کا مجھ پر

www.urduacademyts.com

اثر پڑا ہے۔مختصر افسانوں میں شروع میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹائیگور سے روشنی حاصل کی ہے۔اس کے بعد میں نے اپنا اسٹائل بنالیا۔

۵۔ میں نے کبھی سنجیدگی سے ڈراما کی طرف رجوع نہیں کیا... اگر ڈرامے کو اسٹیج پر نہ دکھایا جائے تو یہ اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔میرے ڈرامے محض پڑھنے کے لئے تھے اسی لئے میں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے ناول کو ترجیع دی ہے۔

۶۔ ایک ادیب کے لئے سینما مناسب جگہ نہیں۔ میں اس لائن میں اس لئے آیا تھا کہ شاید مالی اعتبار سے کچھ مطمئن ہوسکوں مگر یہ میری خام خیالی تھی،اس لئے میں پھر ادب کی خدمت میں لگ رہا ہوں۔

۷۔ میں کبھی جیل نہیں گیا، میں باعمل انسان نہیں ہوں۔ میری تحریروں سے کئی دفعہ حکومت ناراض ہوئی اور میری ایک دو کتابیں قابل ضبطی بھی قرار دی گئیں۔

۸۔میں ساماجک سدھار پر یقین رکھتا ہوں۔ہمارا مقصد رائے عامہ کو بیدار کرنا ہونا چاہئے۔انقلاب سنجیدہ طریقوں کی ناکامی کی دلیل ہوتا ہے.... معیاری سوسائٹی وہ ہے جہاں پر ہر ایک کو یکساں مواقع میسر ہیں''۔

(پریم چند کے خطوط،ص۔۳۳۳۔۳۴۳)

دراصل پریم چند کے خطوط میں ان کی ذاتی زندگی، ان کے ادب اور نظریہ ادب کے علاوہ ان کے عہد کے سیاسی معاشی اور تہذیبی حالات اور ادبی رجحانات پر جس طرح کہیں اشاروں، کنایوں میں اور کہیں تفصیل کے ساتھ معلومات ملتی ہیں ان سے پریم چند کے ادبی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔مرزا غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط قاری کو ''استغفراللہ اور ماشاء اللہ'' کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔لیکن پریم چند کے خطوط عوام وخواص کو اس ملک کے عام آدمیوں کے ساتھ ساتھ ادب اور ادیبوں کے مسائل پر بھی غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔یہی پریم چند کے خطوط کی خوبی بھی ہے اور مقصد بھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر الطاف حسین نقشبندی
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو
سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر

مضامین

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف' خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں ۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروارہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی' اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔

ادارہ قومی زبان

www.urduacademyts.com

ساحرلدھیانوی
رومان، احتجاج اور محبت کی تثلیث کا غزل گوشاعر

شبنم شمشاد

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو شعر وادب کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ نئی ادبی تبدیلیوں نے زور پکڑا اور نئے شعری سانچے خلق کئے جانے لگے۔ یہ انقلاب ادب کی دونوں اصناف یعنی شعری اور نثری اصناف کے حوالے سے برپا تھا۔ نثر کے میدان میں افسانوی اور غیر افسانوی دونوں سطحوں پر اس کے اثرات کو دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ افسانوی نثر میں ناول اور افسانہ نئی تبدیلیوں سے دوچار ہوا۔ انسانی زندگی اس کے مسائل سے لبریز افسانے اور ناول منظر عام پر آئے۔ غیر افسانوی نثر کے میدان میں بھی تمام اصناف مثلاً سفر نامے، رپورتاژ، خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے۔ شاعری کے میدان میں بھی نظم نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ نظم کی نئی اصناف مثلاً آزاد نظم اور نثری نظم کے حوالے سے بحث و مباحثوں اور مکالموں کی ابتدا ہوئی۔ ہاں یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ترقی پسند نظریات کے حامل شعرا کے یہاں غزل سے دوری نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ غزل سے دوری کا رویہ تو اس سے پہلے بھی نظر آتا ہے جب مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں اردو کی تمام شعری اصناف پارینہ کا جائزہ لیا۔ قصیدہ کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا۔ مرثیے پر الزام لگایا کہ اسے واقعۂ کربلا تک محدود کردیا گیا ہے۔ مثنوی کو انہوں نے ضرور کارآمد صنف سخن قرار دیا مگر اس کے حوالے سے وہ تاریخی جملہ کہا کہ ''روشنی کے فرشتے سے تاریکی کا کام لیا گیا ہے''۔ غزل ان کے نزدیک معتوب صنف سخن ٹھہری۔ بقول ان کے:

''غزل روایتی عشقیہ مضامین سے بھرپور ہے اور اس کا بیشتر حصہ دریابرد کرنے کے لائق ہے''۔

مولانا الطاف حسین حالی ایک مقصدی نقطۂ نظر لے کر میدان ادب میں اترے تھے۔ ان کا مقصد قوم کی اصلاح تھا اور قوم کو اس قعر مزلت سے نکالنا تھا جس میں وہ پھنس گئی تھی۔ لہٰذا ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور نئے شعری اسلوب منظر عام پر آئے۔ بطور خاص علامہ اقبال جنہوں نے اپنی نظم کو بھی غزل کی چاشنی سے بھر دیا تھا اور مجھے کہنے دیجئے کہ ان کی نظم ترقی پسند شعرا کے لیے ایک فارمولا بن گئی تھی۔ غزل گوئی ایک طرح سے ترقی پسند حلقوں میں ایک معتوب صنف سخن قرار دی گئی تھی۔ ترقی پسند شعرا کے پیش نظر کچھ تحریکی تقاضے تھے جو غزل سے دوری اختیار کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ جب شہنشاہِ متغزلین جگر مرادآبادی یہ کہنے پر آمادہ ہوں تو کسی ایرے غیرے کی بساط ہی کیا:

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

www.urduacademyts.com

لیکن ان تمام تر نظریات کے باوجود آسمان غزل پر کُہا سے کے بادل چھائے تو ضرور مگر غزل کی فطری مقبولیت کے سبب جلد ہی چھٹ بھی گئے۔

ترقی پسندوں کے زمانے میں جن چند غزل گوشعرا کے یہاں اپنے زمانے کی سچی اور زندہ جاوید غزل کے نمونے دستیاب ہیں ان میں فیض احمد فیض ،مخدوم محی الدین اور مجروح سلطان پوری کے بعد سب سے محترم نام عبد الحئی ساحرلدھیانوی کا ہے۔حالانکہ ساحر کے مجموعوں ''پرچھائیاں'' اور ''تلخیاں'' میں غزلوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے مگر مجروح سے کئی گُنا اور فیض سے ذرا سا کم۔مگر ان کی غزل اپنے موضوعات اور طرز بیان کی بدولت ایک نئے ذائقے کی حامل ہے۔لیکن ساحر کی غزل گوئی کے تجزیے سے قبل ساحر کی شعری اور فکری نشوونما کا تجزیہ ضروری ہے جس کی وجہ سے ساحر ترقی پسند غزل گویوں میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے پیش نظر نظم کی طرح غزل میں ایسے موضوعات کو پیش کیا گیا جن سے عوام کے شعور میں بیداری آئے۔ساحر بھی اس زمانے میں ترقی پسند ادیبوں اور شعرا کی اس کہکشاں کا حصہ تھے۔جو عوام کے دکھ درد میں اپنی شاعری کے ذریعہ شریک حال رہتے تھے۔ساحر کی غزلوں کا بیشتر حصہ انہیں احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔چند مثالیں پیش نظر ہیں:

بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

ooo

دنیا تو ہمارے سامنے ہے، جنت کا پتہ کیا ہو کہ نہ ہو
جنت میں چھپی دولت کے لیے دنیا کا خزانہ کیوں چھوڑیں

ooo

ہمیں سے رنگِ گلستاں، ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ooo

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں

مذکورہ بالا اشعار کو پڑھ کر غزل کی زندہ جاوید مثالوں کے کئی استعارے ذہن میں جگمگاتے ہیں۔مثلاً دیگر شعرا جو ساحر کے معاصرین بھی ہیں ان کے یہاں بھی انہیں خیالات اور احساسات کی ترجمانی نظر آتی ہے۔مگر زندگی، عشق اور رومان کا جو تصور ساحر کے یہاں نظر آتا ہے وہ انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز بنا دیتا ہے۔بقول علی سردار جعفری:

''ترقی پسند شاعروں کا محور رومان اور احتجاج ہے۔ فیض کے یہاں محبوبہ کا وہ تصور نہیں ہے جو ساحر کے یہاں ہے مخدوم ومجاز کی شاعری کا محور بھی رومان اور احتجاج رہا ہے۔مگر ان چاروں ہم عصر شعرا کے مزاج الگ الگ ہیں۔مجاز کے یہاں سرفروشانہ سرشاری ہے۔فیض کے یہاں معشوق نواز حسن پرستی اور ساحر کے یہاں عاشقانہ انانیت۔''

www.urduacademyts.com

ہم کہنا چاہیں گے کہ یہی عاشقانہ انانیت ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔اس امتیاز کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

میری محبوب یہ ہنگامۂ تجدید وفا
میری افسردہ جوانی کے لیے راس نہیں

ooo

مجھ میں کیا دیکھا کہ تم الفت کا دم بھرنے لگیں
میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آ سکتا نہیں

ooo

میں اور تم سے ترک محبت کی آرزو!
دیوانہ کر دیا ہے غم روزگار نے

اکثر وبیشتر ساحؔر کے ایامِ طفلی کی مصیبتوں، پریشانیوں اور کلفتوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ انسان کی ابتدائی زندگی بطورِ خاص اس کے بچپن کے حالات ذہنی نشو ونما پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ساحؔر کے یہاں معاملہ کچھ زیادہ ہی شد ومد کے ساتھ تھا۔ساحؔر کے والد پنجاب کے ایک متمول جاگیردار تھے۔اولاد نرینہ کی جستجو میں وہ پے در پے شادیاں کرتے چلے گئے مگر جب اولاد نرینہ کی شکل میں عبدالحئ نے ان کے گھر میں جنم لیا تو ان کے والد نے ساحؔر کی والدہ اور ان سے منھ موڑ لیا۔ساحؔر کو اس کا آئینی حق دلوانے کے لیے والدہ نے کورٹ کچہری کا سہارا لیا۔مگر حادثات اور تجربات نے معصوم ساحؔر کے ذہن پر جو اثرات مرتب کیے وہ کبھی نہیں مٹ سکے اور ساحؔر ان سے خود کو بھی الگ نہیں کر سکے۔ویسے بھی ''تلخیاں'' کے پہلے ایڈیشن کے سرنامے پر جو شعر انہوں نے لکھا تھا وہ ان کی شاعری کے تمام تر پس منظر کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

مذکورہ بالا شعر ساحؔر کی تمام تر فکر کی نمائندگی کرتا ہے اور اسی فکر کے اظہار کی بدولت کلام ساحؔر کے امتیازات بھی نمایاں ہوئے۔ان کے چاہنے والوں نے ان کے تصورات کی ہمہ گیری سے فیض بھی اٹھایا اور حظ بھی' زندگی کے انہیں تجربات وحادثات نے ساحؔر کی شخصیت میں کبھی کبھی ابل کر باہر آنے والی غضبناکی کو بھی ہوا دی اور ان کے شعری لب ولہجے کو ایک اعتماد عطا کیا کہ آج ایک نصف صدی بعد بھی ان کے کلام کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔انہیں تجربات وحادثات سے پر غزلوں کے چند اشعار پیش نظر ہیں:

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

ooo

زندگی کا نصیب کیا کہیے
ایک سیتا تھی جو ستائی گئی

ooo

ادھر بھی ایک اچٹتی نظر کہ دنیا میں
فروغِ محفلِ جم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

www.urduacademyts.com

مذکورہ بالا اشعار میں فلسفہ بھی ہے اور جمالیاتی اظہار کا سلیقہ بھی ۔ لہٰذا معروف نقاد مجنوں گورکھپوری کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ:

''ادب انسان کے جذبات و خیالات کا ترجمان ہے اور انسان کے جذبات و خیالات تابع ہوتے ہیں زمانے اور ماحول کے جیسا دور اور جیسی معاشرت ہوگی ویسے ہی جذبات و خیالات ہوں گے اور پھر ویسا ہی ادب ہوگا۔''

یقیناً ساحرؔ جس عہد میں سانس لے رہا تھا وہاں ایشیاء کی تمام آبادی برطانوی نوآبادیات کے خونی شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی ۔ لہٰذا تمام تر ترقی پسند شعرا کے یہاں احساسِ غلامی کی کیفیت موجود ہے اور ساحرؔ کا تمام تر کلام اور اس کی بیشتر غزلوں میں بھی انہیں حالات اور احساسات کی ترجمانی نظر آتی ہے:

جرأت انساں پہ گو تادیب کے پہرے رہے
فطرت انساں کو کب زنجیر پہنائی گئی

ooo

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

ooo

اس رینگتی حیات کا کب تک اٹھائیں بار
بیمار اب الجھنے لگے ہیں طبیب سے

ooo

اگلی دنیا کے فسانے چھوڑ کر
اس جہنم زار کی باتیں کریں

مذکورہ بالا اشعار اس ردعمل کا اظہار ہیں جو شاعر کو اپنے عہد کی دین تھا ۔ ان اشعار میں ایک عجیب سی رومانی کیفیت بھی ہے ،دل کے سمندر میں احتجاج کی اٹھتی ہوئی موجیں بھی، ناکام تمناؤں کی کسک بھی اور ایک بہتر زندگی کے خواب بھی ۔ اس لیے بقول سردار جعفری ساحرؔ کی شاعری اور بطور خاص غزل کا محور رومان اور احتجاج کو قرار دیا جاسکتا ہے:

ہم نے خزاں کی فصل چمن سے نکال دی
ہم کو پیام مرگ بہاروں میں آئے گا

ooo

ہر قدم مرحلۂ دار وصلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے

ooo

زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

ooo

اس طرف سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے
آج تک سلگتے ہیں زخم رہ گزاروں کے

☆☆☆

شبنم شمشاد
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،
علی گڑھ

مضامین

www.urduacademyts.com

حفیظ جالندھری کی غزلوں میں تلمیحات کا مطالعہ
''نغمۂ زار'' اور ''سوز و ساز'' کے حوالے سے

حفیظ جالندھری اردو شعراء کے صف میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ان کی دنیا 1900ء سے 1982ء تک قائم رہی۔حفیظ نے اردو شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے،جن میں گیت،نظم،غزل وغیرہ شامل ہیں۔حفیظ کو ادبی دنیا سے متعارف کرانے میں ''شاہنامہ اسلام'' اور ان کی غزل گوئی بنیادی وجہ بنی۔اس کتاب میں انہوں نے کم وبیش پوری اسلامی تاریخ کو قلمبند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اسی کتاب کی مقبولیت کے ان کے گیت آج بھی مقبول ہیں۔''شاہنامہ اسلام'' جیسا شاہکار کارنامہ انجام دے کر شایقانِ ادب ان سے رشک کرنے لگے۔اس کتاب کو پڑھ کر اقبالؔ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔کیوں کہ اقبالؔ کی شاعری بھی تاریخ اسلام کا منبع ہے۔حفیظ اقبالؔ سے کافی متاثر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہی رنگ وآہنگ دیکھنے کو ملتا ہے جو اقبالؔ کے ہاں نظر آتا ہے۔حفیظ جالندھری کے چار شعری مجموعے ہیں،نغمہ زار،سوز وساز،تلخابۂ شیریں اور چراغِ سحر کے عنوان سے منظرِ شہود پر آچکے ہیں۔جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ حفیظ نے کئی اصناف پر طبع آزمائی کی۔لیکن ان تمام میں غزل ان کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔ان کی غزلوں میں موضوعات کا تنوّع ہے۔ساتھ ہی ساتھ ان کی غزلوں میں غنائیت بھی بہت زیادہ ہے۔اردو کے دوسرے شعرا کی طرح حفیظ نے بھی اپنی غزلوں میں صنعتوں کا بہت زیادہ استعمال کیا ہے۔یہاں ان کی غزلوں میں صنعتِ تلمیح پر لب کشائی کی جائے گی۔جیسے اقبالؔ کے کلام میں صنعت تلمیح نے اپنی جگہ بنائی ہے وہیں حفیظ جالندھری کی غزلوں میں بھی یہ صنعت کثرت سے دیکھنے کو ملتی ہیں۔حسن یا خوبصورتی کو پسند کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔جیسے ہر کوئی انسان اپنی نمائش کے لیے اچھے اچھے کپڑے زیب تن کرتا ہے ویسے ہی ادیب و شعرا اپنے کلام کو مزیّن کرنے کے لیے علم بدیع یعنی صنعتوں کا استعمال کرتے ہیں۔صنعت سے کلام میں تاثر اور چاشنی پیدا ہوتی ہے۔

لغوی اور اصطلاحی معنوں میں تلمیح سے مراد کلام میں کسی قصّے یا تاریخی واقعے یا کردار کا جزوی یا کلّی اظہار اور اس کی طرف واضح اور ناگزیر اشارہ کرنا ہے۔علم بدیع کی ایک اہم اور ناگزیر شاخ کی حیثیت سے تلمیحات خاص اہمیت کی حامل ہیں۔صنعتِ تلمیح کا استعمال بہت پہلے سے کیا جارہا ہے۔محمود نیازی اپنی کتاب ''تلمیحات غالب'' کے دیباچے میں تلمیحات پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

''ان الفاظ (تلمیحات) کو سنتے ہی پورے واقعہ کی تصویر ہمارے سامنے خود بخود آجاتی ہے اور تفصیل کے ساتھ واقعہ بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ان اشاروں یا

www.urduacademyts.com

تلمیحی الفاظ کے لیے یہ شرط لازمی ہے کہ ان سے متعلق قصّے، کہانیاں اور مسائل عام فہم ہوں اور ان کو دائمی شہرت حاصل ہو۔ اگر وہ مشہور اور عام فہم نہیں ہیں تو ان کو تلمیح نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ تمام لغت، محاورے، ضرب المثال اور کہاوتیں تلمیح کے دائرے میں آتی ہیں جن سے کوئی قصہ یا کہانی وابستہ ہے اور عام طور پر لوگ ان کے قصّوں سے واقف ہیں۔'' (تلمیحاتِ غالبؔ، محمود نیازی، ص ۹، اشاعت ۱۹۷۲، غالب اکیڈمی، نظام الدین، نئی دہلی)

پروفیسر شمیم حنفی اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

''شمس قیس رازی نے تلمیح کی تعریف یہ بیان کی تھی کہ اس کا کام کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معنی پر دلیل قائم کرنا ہے اور یہ کہ اس صنعت کو بلاغت کے علماء طول کلامی پر ترجیح دیتے ہیں۔''

(بحوالہ تلمیحات، مرتبین ڈاکٹر مظہر احمد ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۷، ص ۱۳)

تلمیح کا استعمال اس لیے بھی کیا جاتا ہے تا کہ کسی تاریخی واقعے کا احاطہ چند لفظوں میں کیا جائے۔ تلمیح سمجھنے کے لیے اس تاریخی واقعے کا علم ہونا ضروری ہے جس کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہوگا جس سے قاری کو شعر کے معنی و تفہیم سمجھ میں آجائے۔ عہد قدیم میں تلمیح کو لگ بھگ ہر شاعر استعمال کرتا تھا۔ تلمیح کا استعمال شاعر کے قادرالکلامی کا ثبوت ہوتا تھا۔ لیکن اگر موجودہ صورت حال کی طرف نظر ڈالی جائے تو تلمیح کا استعمال بہت کم یعنی چاول میں کنکر کے برابر استعمال کیا جاتا ہے۔

راقم السطور نے اس مضمون میں حفیظؔ جالندھری کی غزلوں میں تلمیحات کا احاطہ کیا ہے۔ ان اشعار کی تشریح یہاں پیش نہیں کی جائے گی بلکہ اشعار میں جو تلمیحات استعمال کئے گئے ہیں ان کی طرف قارئین کی توجہ مرکوز کرنا مطلوب ہے۔ حفیظؔ جالندھری کی غزلوں میں جو تلمیحات راقم الحروف نے تلاش کیے ہیں۔ وہ یوں ہیں:

شوق میرا طالبِ دیدار ہو جاتا اگر
دیکھتا موسیٰ مجھے، سینا مجھے، جلوا مجھے

موسیٰؑ: اس شعر کی تلمیح ''موسیٰؑ'' ہے۔ حضرت موسیٰؑ پانچ اولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک ہیں جن کو قومِ بنی اسرائیل کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ موسیٰؑ کی کئی خصوصیات تھیں لیکن انھیں جس خصوصیت نے دوسرے پیغمبروں سے انفرادیت عطا کی وہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی ہے۔ اس لیے شاعروں نے ''موسیٰؑ کو تلمیحاً اپنی شاعری میں جگہ دے دی۔ حفیظؔ جالندھری نے بھی اس تلمیح کا استعمال کئی بار کیا ہے:

رونے والوں نے مسیحا کو کیا جھک کر سلام
لائے تھے حضرت نویدِ زندگی میرے لیے

مسیحا: اس شعر کی تلمیح ''مسیحا'' ہے۔ حضرت عیسیٰؑ بھی اولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک ہیں۔ جن کو قومِ بنی اسرائیل کا آخری رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ مسیحا ان کا دوسرا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی کئی خصوصیات سے نوازا تھا جن میں سے ''مادرزاد اندھوں کو بصارت عطا کرنا، کوڑھ والے

www.urduacademyts.com

بیماروں کو شفا بخشنا اور مردوں کو زندگی بخشنا'' قابل ذکر ہیں۔

توحید پہ ناز ایسا ، دل محوِ ایاز ایسا
توڑا نہ گیا تجھ سے محمود یہ بت خانہ

ایاز اور محمود: محمود اپنے وقت کا عادل بادشاہ اور ایاز ان کا غلام تھا۔ایاز نے اپنے بادشاہ کی خدمت میں کوئی کمی باقی نہیں رکھی تھی۔تب سے آج تک شعراء ادب نے ان کو تلمیح کا لباس اوڑھ کر اپنی شاعری میں جگہ دی ہے:

ہاں احترامِ کعبہ و بت خانہ چاہیے
مذہب کی پوچھیے تو جدا گانہ چاہیے

کعبہ اور بت خانہ: ''کعبہ'' سعودی عرب میں ایک متبرک جگہ کا نام ہے جہاں پر اللہ تعالیٰ کی عبادت روز کی جاتی ہے اور خاص کر مسلمان ہر سال اس کعبے کی زیارت کر کے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں۔بت خانہ ہر وہ جگہ کہلاتا ہے جہاں غیر مسلم اپنی طرح سے عبادت کرتے ہیں۔

پیا آبِ بقا اے خضر، اب تا ثیر بھی دیکھو
قیامت تک رہو پابندِ عمرِ جاوداں ہو کر

خضر: حضرت خضرؑ اپنی وقت کے بڑے ولی اللہ تھے۔ تاریخ کے کتابوں میں ان کو پیغمبر کے طور پر بھی متعارف کیا گیا ہے۔خضرؑ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں تھے۔ان کا مقام کافی اونچا تھا اور ہر دور میں ان کو تلمیح کے تناظر میں استعمال کیا جاتا ہے۔ان کا سب سے خاص وصف یہ تھا کہ انھیں عمرِ طویل حاصل تھی۔اردو شاعری میں ان کو عمرِ خضر اور عمرِ جاوداں کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔اردو کا کوئی شاعر ایسا نہ گزرا ہو جس نے تلمیح کے طور پر خضر کا سہارا نہ لیا ہو:

کچھ تعجب نہیں کعبے میں اگر جی نہ لگے
آئے ہیں ہم طرفِ دیر و کلیسا ہوکر

دیر و کلیسا: دیر جس کا دوسرا نام بت خانہ ہے جہاں پر ہندو اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرتے ہیں اور کلیسا عیسائیوں کا گرجا گھر ہے جہاں وہ بھی اپنے طور طریقے سے عبادت کرتے ہیں:

عشق کے انصاف پر فرہاد بھی ہے سرنگوں
یہ نہ تھا معلوم تیشہ کوہ کن ہوجائے گا

تیشۂ فرہاد اور کوہ کن: کوہکن فرہاد کا لقب تھا اور شیریں کا عاشق تھا۔خسرو پرویز نے فرہاد سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے بے ستون کو تراش لیا تو اسے شیرین دے دی جائے گی۔فرہاد اٹھ کر چل پڑا اور پہاڑ کھودنے کا عمل شروع کیا۔وہ شیرین کے عشق میں دیوانہ ہو کر کام میں مصروف ہوگیا۔اس نے ستون پر شیرین کا ایک مجسمہ بھی تراش لیا تھا اسی کو دیکھ کر روزانہ اپنے دل کو تسلی دیتا تھا جب اس نے اپنا کام محنت و لگن سے مکمل کیا اور وعدہ پورا کرنے کا وقت آپہنچا تو پرویز نے شیرین کی موت کی جھوٹی خبر پھیلائی' اس کو سُن کر فرہاد نے مایوسی کے عالم میں اسی تیشہ سے خود کو ختم کر دیا۔

ہوائے جاہ و دولت وجہِ ناکامی ہوئی ورنہ
ہمارا بوریائے بے ریا تختِ سلیماں تھا

تختِ سلیمانؑ: حضرت سلیمانؑ حضرت داودؑ کے فرزند تھے۔والد بھی نبی تھے اور بیٹے کو بھی نبوت عطا ہوئی۔حضرت

www.urduacademyts.com

سلیمانؑ وہ پیغمبر ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ ساتھ بادشاہت بھی عطا کی تھی۔ وہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ جنوں، چرندوں اور پرندوں پر بھی حکومت کر رہے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ جانوروں کی بول باش سے بھی باخبر تھے۔ اس کے علاوہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہوا بھی مسخر کر رکھی تھی اور ہوا میں اُڑان بھر کر مہینوں کا سفر ایک دن میں طے کر لیتے تھے۔ اس لیے ان کی سلطنت کا تخت مشہور تھا اور شعراء ادب نے ''تختِ سلیمان'' تلمیح کے طور پر استعمال کیا ہے:

چھیڑو نہ میٹھی نیند میں اے منکر و نکیر
سونے دو بھائی میں تھکا ماندہ ہوں راہ کا

منکر و نکیر: نکیر و منکر کا ذکر بار ہا جگہوں پر قرآن پاک میں آیا ہے۔ نکیر و منکر دو فرشتوں کے نام ہیں جو مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق مرنے کے بعد قبر میں سوال کرتے ہیں۔ ان کے سوال کا جواب جو دے پاتے ہیں وہ صاحب جنت ہوتے ہیں اور جو جواب نہیں دے پاتے وہ واصلِ جہنم ہوتے ہیں۔ نکیر و منکر کو بھی تلمیحاً استعمال کیا جاتا ہے۔

نہ کرنا بھول کر رخ اس طرف اے ناقۂ لیلیٰ
غبارِ قیس پھرتا ہے ابھی تک نجد کے بن میں

غبارِ قیس اور ناقۂ لیلیٰ: غبارِ قیس عرب کا ایک عاشق مزاج آدمی تھا بلکہ محمود نیازی نے اپنی کتاب ''تلمیحات'' کے صفحہ نمبر ۳۰۲ پر رسوائے زمانہ عاشق لکھا ہے۔ ناقۂ لیلیٰ جن پر وہ عاشق ہوا تھا۔ قیس کو ناقۂ لیلیٰ کی جدائی برداشت نہیں ہوتی تھی اس لیے وہ اس کے غم میں نجد کے ریگستان میں گھومتا پھرتا تھا۔ ناقۂ لیلیٰ کا علاقہ بھی اسی راستے سے گزرتا تھا اور کبھی کبھار ان کی ملاقات بھی ہوتی تھی کہ آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

سزائے معصیت اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی
الٰہی میکشوں کو غرق کردے حوضِ کوثر میں

حوضِ کوثر: حوضِ کوثر جنت میں ایک نہر کا نام ہے جس میں قیامت کے دن جنتیوں کو پانی پلایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو یہ کوثر عطا فرمایا جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ''انا اعطینک الکوثر'' ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا ہے۔ حوضِ کوثر پر اللہ کے حکم سے پیغمبر ﷺ جس کو چاہیں گے عطا فرمائیں گے۔ اردو شعرا نے حوضِ کوثر کو اپنی شاعری میں تلمیح کے طور پر مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے اور حفیظؔ جالندھری ان میں سے ایک ہیں۔

مجھ کو نہ سنا خضر و سکندر کے فسانے
میرے لیے یکساں ہے فنا ہو کہ بقا ہو

خضر و سکندر: خضر کا ذکر ہم پچھلے صفحے میں کر چکے ہیں۔ سکندر کو سکندر اعظم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سکندر اعظم دنیا کا وہ بادشاہ گزرا ہے جس نے بہت کم عمر میں ہی دنیا کے بیشتر علاقوں کو فتح کیا تھا۔ دارا، جو ایران کا بہت بڑا بادشاہ تھا اس کو بھی سکندر اعظم مات دے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ دارا نے مرتے وقت سکندر کو اپنی بیٹی کے بارے میں وصیت کی تھی اور سکندر نے اس وصیت کی تعمیل کی۔

www.urduacademyts.com

عشق پھر کرنے لگا دعویٰ انا المنصور کا

پھر زباں زد قصہ دار و رسن ہو جائے گا

منصور: منصور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا۔ اس کا کہنا تھا جو میں بولتا ہوں وہی حق ہے اس لیے اس کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ تاریخ میں ان کو صوفی حضرات شہید کہتے ہیں۔ صوفیوں کا کہنا ہے کہ وہ (منصور) خدا کا سچا عاشق تھا اس لیے اس کے زبان سے یہ کلمہ نکلا لیکن اکثر علماء ان کو ملحد سمجھتے تھے ان کا کہنا ہے کہ جو نعرہ انہوں نے لگایا وہ اسلام میں کفر کا کلمہ ہے اس لیے اس وقت کے عالموں نے اس کو سولی پر چڑھایا تھا۔

میہماں وہ برق وش ہے آج قسمت سے حفیظ

بن گیا ہے وادیٔ ایمن مرا کاشانہ آج

وادیٔ ایمن: وادیٔ ایمن کوہ طور کے دامن میں ہی واقع ہے۔ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ اپنے خسر کی بکریاں چراتے ہوئے ایک دن اس وادی میں جا پہنچے تھے ان کے بیوی اور بچہ بھی ساتھ تھے جب رات ہوئی اور ٹھنڈ بہت ہوگئی تو آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے چقماق (وہ پتھر جس پر لوہا مارنے سے چنگاریاں اُڑتی ہیں) استعمال کیا لیکن سخت سردی کے باعث اس نے بھی ساتھ نہ دیا۔ حضرت موسیٰ نے آگ کی تلاش میں جب سامنے وادی پر نظر دوڑائی تو ایک شعلہ سا چمکتا ہوا نظر آیا۔ وہ آگ کا شعلہ نہیں بلکہ تجلی الٰہی کا نور تھا پھر اس وادی میں حضرت موسیٰ کو حق تعالیٰ سے شرف ہم کلامی کا حق حاصل ہوا۔ اسی وادی میں ان کو نبوت و رسالت سے نوازا گیا اور دو بڑے معجزے ''ید بیضا'' اور ''عصائے موسیٰ'' عطا کئے گئے۔ وادی ایمن کو ''وادیٔ مقدس'' بھی کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس وادی کو اسی نام سے پکارا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حفیظ جالندھری کی شاعری میں تلمیحات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ حفیظ جالندھری نے اپنی شاعری کی زبان صاف اور شگفتہ انداز میں بیان کی ہے۔ سہل الممتنع میں اگر اردو کے شعرا کی ترتیب دی جائے گی تو حفیظ ان کی صف میں ضرور شامل ہونگے۔ صنعتِ تلمیح کو بھی انہوں نے بڑے بلیغ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

☆☆☆

گلزار احمد ماگرے
ریسرچ اسکالر یونی ورسٹی آف حیدرآباد
موبائل: 7006739269

گول روٹی نہیں بنی ۔۔۔ اور اس پر ساس کا بہترین ردِ عمل

بہو کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ شادی کے چند دن بعد ہی آج تیسری مرتبہ روٹیاں گول نہیں بنی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ آج اس کی خیر نہیں۔ کھانے کے دوران اس کی ساس نے اسے دیکھا، اور پھر اس کے کانوں میں ان کی شفقت بھری آواز آئی،

''بیٹی، کوئی بات نہیں۔ گول روٹیاں، بہو کے اچھے کردار اور ماں باپ کی بہترین تربیت اور تہذیب سے بڑھ کر نہیں۔ پھر کھانے میں نخرے اور ناپسندیدگی ہمارے دین کا طریقہ نہیں۔ کوئی بات نہیں، تمہارا اپنا گھر ہے، سیکھ جاؤ گی، آؤ کھانا کھائیں۔"

کوئی انسان اپنے جگر کا ٹکڑا کسی کو ایسے نہیں دیتا۔ دوسروں کی بیٹیوں کو اپنی بیٹی سمجھیں کہ آپ کی اپنی بیٹی دوسرے گھر خوش رہے۔

ماخوذ

www.urduacademyts.com

پریم ناتھ در کے افسانوں میں کشمیر

ہر علاقہ کے تہذیبی ارتقا میں وہاں کے جغرافیائی حالات اور تاریخی واقعات کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ صوبہ کشمیر بھی اس سے اچھوتا نہیں ہے۔ کشمیری تہذیب ہزاروں سال کی طویل مدت میں مختلف تاریخی مراحل سے گزر کر آج اس منزل پر پہونچی ہے لیکن اس منزل تک پہنچنے سے پہلے کشمیر کی سرحدیں مختلف دور میں سیاسی دباؤ، جغرافیائی اثرات اور تاریخی اثرات کے زیر اثر ایک صورت پر قائم نہیں رہی ہیں۔ ان میں وقت بہ وقت پھیر بدل ہوتا رہا ہے۔ جموں و کشمیر کی تہذیب و ثقافت سے روبرو کرانے میں یہاں کے ادیبوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

ادب کسی ایسے معاشرہ کے آغوش میں نمو پذیر ہوتا ہے جو اپنی ایک ثقافت رکھتا ہے۔ ادب کے ذریعے معاشرہ کے افراد اپنے احساسات و افکار کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کے لیے ایک ایسا وسیلۂ ترسیل بنتا ہے جس کے ذریعہ معاشرہ کے لوگ آپس میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور اپنے خوابوں، آرزوؤں اور تمناؤں سے دوسروں کو آگاہ کرتے ہیں۔ اردو ادب میں پریم ناتھ در نے بھی اپنی کہانیوں کے ذریعہ کشمیری تہذیب و ثقافت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کشمیر چونکہ صدیوں سے کئی تہذیبوں اور معاشروں کا گہوارہ رہا ہے۔ کشمیر کے قدیم سماج میں ناگ اور پشاچ قوم کے لوگ آباد تھے، پہاڑی ڈھلانوں میں ان کی بستیاں آباد تھیں، جنتر منتر کا استعمال یہ لوگ کرتے تھے۔ جب آریہ قوم کے قبیلے کشمیر میں آباد ہوئے تو ناگوں اور آریوں میں کئی جنگیں ہوئیں۔ آخر ایک صلح ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ آرین گرمیوں کا موسم وادی میں بسر کریں اور ناگ اور پشاچ اپنی گرمیاں پہاڑی علاقوں میں گزاریں۔ سردیوں میں آرین کشمیر کو چھوڑ کر جموں، پنجاب، راجستھان اور گجرات کے علاقوں میں اپنی زندگی بسر کریں۔ کشمیر کی اس وقت کی صورت حال کو رسالہ 'آج کل'، کشمیر نمبر (1955) میں جیالال ناظر نے یوں بیان کیا ہے:

''ایک دفعہ چندر دیو نامی برہمن سردیوں میں کشمیر میں ہی رہا۔ ادھر سے ناگ جب پہاڑوں سے اتر کر کشمیر میں وارد ہوئے تو انھوں نے چندر دیو نامی برہمن کو دیکھ لیا وہ اسے اپنے راجہ نیل ناگ کے پاس لے گئے۔ نیل ناگ نے برہمن کی زبانی آرین نسل کے لوگوں کی قابل رحم حالت سن لی۔ اس نے ایک کتاب برہمن کے حوالے کی اور کہا کہ تم لوگ اس کتاب میں دی ہوئی ہدایت پر عمل کرنے سے ناگوں کو اپنا دوست پاؤ گے۔ اس کتاب کا نام بعد میں نیل مت پوران مشہور ہوا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ناگ پشاچ کے لوگوں کے ساتھ آرین نسل کے لوگ گھل مل گئیں اور کشمیریوں کا ایک مشترکہ معاشرہ وجود میں آیا۔''1

کشمیری سماج کا سب سے بڑا پہلو اس کی روایتی سمجھ رہا ہے۔ کشمیری سماج کا یہ ماننا رہا ہے کہ دین دھرم فرد کے

www.urduacademyts.com

اپنے ایمان کی بات ہے۔ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آتا۔ نہ دوسرے کے ایمان کو بگاڑ سکتا ہے۔ کشمیر میں رشیوں منیوں اور صوفیوں کے دور میں بھی یہی بات تھی اور بعد میں بھی یہی بات رہی۔ جس کے تاریخی شواہد للتادتیہ اور زین العابدین کے دورِ حکومت میں بآسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ دونوں کی بے انتہا طاقت تھی جو چاہتے کر سکتے تھے لیکن للتادتیہ نے ہندو ہوتے ہوئے بدھ مت کو ریاست میں پھلنے پھولنے کا موقع دیا اور دونوں دھرموں کے لوگوں کو اکٹھا کر کے مذہبی مباحث کروائے۔ ایسا ہی زین العابدین نے کیا۔ زین العابدین نے ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کیا۔ کشمیر کی اس رواداری کے حوالے سے پریم ناتھ در اپنے مضمون ''کشمیری شخصیت'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت آدم کے دو ہی بیٹے تھے ایک نے قبر کو پسند کیا ایک نے شمشان کو یہ ہے کشمیری شخصیت کا وہ بڑا پہلو جس کے مطالعے سے ایک بہت بڑا جھگڑا دنیا سے مٹ سکتا ہے کیوں کہ تبھی ناواقفوں کو سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ کشمیری اپنے سیاسی فیصلوں یا اپنے سماجی اور اقتصادی تجویزوں میں مذہب کے دخل کو کیوں غلط کہتا ہے۔''2

پریم ناتھ در کے افسانوں کی بات کریں تو ان کے افسانوں میں کشمیریوں کی جفاکشی، دیانت داری، سادگی اور غیر جانبداری دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں کشمیر کے رسم ورواج کھانوں اور میووں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔اس ضمن میں ان کے افسانے ''گیت کے چار بول''، ''کاغذ کا واسدیو''، ''چڑھاوا''، ''نیلی آنکھیں''، ''کوفتہ''، ''آخ تھو''، ''گدھ''، ''ویسے کا ویسا''، ''پانی کے پاس'' اور ''چڑھاوا'' قابل ذکر ہیں۔

در نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کو پیش کیا ہے۔جس کی ایک مثال افسانہ 'گیت کے چار بول'' ہے افسانہ گیت کے چار بول، جذبات میں ڈوبی ہوئی ایک کہانی ہے۔ اس میں حسن وعشق کا اظہار اور گھٹن بھری زندگی کی تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے۔ اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کشمیر کے غریب لوگ کس طرح پہاڑوں سے برف لاتے ہیں اور شہر میں لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ایک کشمیری گیت جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''واہ یخ واہ یخ ہائے کمہ ونہ وولمک یخ''

اے یخ تو نعمت ہے تو خوشی ہے۔ دیکھ کتنی کٹھن چوٹیوں سے تجھے اتارا۔

''ہایخو کنہ دور گریو یخ''

سن میری یخ اب جو تو میرے پاس ہے میں تیرے لیے کیا کیا نہ کروں گا تجھے بالیاں بھی بنوادوں گا۔

''ہائے تریشہ وارہ مور تھس یخ''

اے یخ تو ظالم بھی تو ہے تم نے میری پیاس بڑھائی پھر پیاسا مارا۔ 3

کشمیر اپنی خوبصورتی کے لیے پوری دنیا میں جانا جاتا ہے لیکن خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اپنے کھانوں اور میووں کے لیے بھی اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ در نے

www.urduacademyts.com

اپنے افسانے ''کوفتہ'' میں کشمیر کے سالنوں اور کھانوں کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''بڑی محنت سے بنائی جاتی ہیں یہ خوبانیاں لالہ پہلے چھری سے ہی بہت باریک کٹوایئے پھر مٹی بھر چھولے کی دال۔ مقدار کے بادام پستے چلغوزے اور مسالے اس میں خوب ملایئے' ابالیے۔ ابالتے جایئے۔ یہاں تک کہ خوب گل جائے پھر اس تمام کو رگڑ رگڑ کر چٹنی بنایئے۔ پھر اس میں گھی اور دہی ملایئے۔ پھر وہ ہاتھ ہوں لالہ خوبانیاں ڈھالنے کی گھی میں اس رنگ تک تلنے کے پھر شیرہ اور کشمیری مسالوں میں ان گولیوں کا دم کیجئے سنتے ہو لالہ۔ اس میں کیسر پڑتا ہے، کیوڑہ، دارچینی، الائچی لالہ لہسن پیاز تو کشمیری کھانوں میں دخل ہی نہیں۔''4

افسانہ 'کوفتہ' کھانوں اور مسالوں کے علاوہ کشمیر کی تہذیب وثقافت اور رسم ورواج کی عکاسی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس افسانے کا ایک اور اقتباس:

''چارپائی پر ایک کشمیری گبہ تھا اور ساتھ میں ایک گول پگڑی تھی۔ بھگت رام نے ایسی ہی پگڑی کا ایک دفعہ ذکر کیا تھا پھر یہ لمبا کرتا یہی ہوگا پیراہن کشمیروں کا جس کی یاد جاڑے میں بھگت رام کو بہت آتی تھی۔ پھر اس لمحے اس کی بے چینی ختم ہوئی۔ اندر سے ایک آدمی چائے کا سماوار لے آیا۔ وہی بھاپ کی گھٹا نکالتا ہوا۔ الائچی، دارچینی اور سبز کی متوالی گھٹائیں۔ وہی کشمیری سماوار اور کانس کی کونڈے نما کٹوریاں۔''5

درنے اپنے افسانوں میں کشمیر کے رہن سہن، بول چال، زیورات و پوشاک، اخلاقی اقدار، انداز فکر غرض کہ ہر گوشے پر انھوں نے نگاہ ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی بھائی چارگی اور رواداری کو بھی بیان کیا ہے۔ کشمیر چونکہ اپنی رواداری اور بھائی چارگی کے لیے جانا جاتا رہا ہے جس کی ایک مثال 1947 کے واقعات کی ہے۔ جب پورے ملک میں فرقہ وارانہ تشدد ہو رہا تھا اس وقت کشمیر ہی ایک ایسا صوبہ تھا جہاں امن اور بھائی چارہ قائم تھا۔ تبھی تو گاندھی جی کو کہنا پڑا تھا کہ مجھے امن کی کرن کہیں سے دکھائی دے رہی ہے تو وہ کشمیر ہے۔ کشمیر میں ہندو اور مسلمانوں کا ایک دوسرے سے قریبی رشتہ رہا ہے جہاں ایک طرف مسلمان نماز میں سجدہ کرتا ہے تو دوسری طرف ہندو اپنے دیوتاؤں کی پوجا کرتا ہے۔ کبھی کسی ہندو کی غیر حاضری میں اس کے گھر کی رکھوالی مسلمان کرتا ہے اور کسی مسلمان کی غیر حاضری میں ہندو اس کے گھر کی رکھوالی کرتا ہے۔ کشمیر میں یہ رواج برسوں سے قائم ہے۔ پریم ناتھ درنے کشمیر کی اسی بھائی چارگی اور رواداری کو اپنے افسانے ''گدھ'' میں بوڑھے کمہار کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ بوڑھا کمہار اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو اپنی بیوی راحتی، بیٹے رسول، پوتے خلیل اور اس کے دوستوں کبیر، رحیم، غفور کے ساتھ ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ بوڑھا کمہار اپنے بنائے ہوئے مٹکے ہندو بھائیوں کو دیتا ہے۔ وہ ان مٹکوں سے شیوراتری کے موقع پر شیو اور پاروتی کے مجسمے بناتے ہیں اور ان کی برات نکالتے ہیں۔ اس برات میں آسمانی اسلامی فرشتے بھی شامل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی کنیادان اور نکاح کی رسمیں بھی ادا کی جاتی ہیں۔ کشمیر میں جب ہر کوئی اسی ماحول میں رنگا ہوا ہوتا ہے

www.urduacademyts.com

تبھی قبائلی کشمیر پر حملہ کرتے ہیں اور ہندوؤں کا پتہ پوچھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اس افسانہ کا یہ اقتباس:

''ایک قبایلی نے بوڑھے کمہار سے سوال کیا۔ دوسرے نے رائفل تانی اور تیسرے نے اس کی پیرائن سے دو انگلیاں اٹھائیں کہ وہ جواب دے، سوال میں دو لفظ کشمیری میں تھے کافر؟ اس گاؤں میں کافروں کے گھر کہاں ہیں۔ وہ اب سمجھا کہ یہ لوگ کافر ہیں اور اپنی برداری کی تلاش میں ہیں وہ ان کی داڑھیوں کے بال بال کو دیکھنے لگا۔ یہ ہیں کافر۔ وہ جگا اور راحتی سے بھی کہنا چاہتا تھا لیکن ہڈیوں پر لوہے کی گرفت اور سخت ہوئی اور دبائی ہوئی انگلیوں کے نیچے سے بھی اس کی آواز بھاگتی نکلی کہ گاؤں میں ایک بھی کافر نہیں۔ کافر اس کے ملک میں نہیں اور جب رائفل والے نے حرکت کی تو اس نے تیسوں سپاروں کی قسم کھالی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا۔''6

در نے اپنے افسانوں میں ہندو اور مسلمانوں کی بھائی چارگی اور رواداری کو بیان کر کے کشمیر کی تہذیب و ثقافت کی ترجمانی کی ہے۔ افسانہ ''گدھ'' میں ہندو بھائیوں کی جان بچانے کے لیے مسلمان بھائی اپنی جان کی قربانی دیتے ہیں۔ آج جہاں کچھ سیاسی جماعتیں اپنی کرسی حاصل کرنے کے لیے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرتیں پیدا کر رہی ہیں اور جگہ جگہ دنگے اور فساد کروا رہی ہیں۔ لوگ اپنے ہی ملک میں اجنبی بن گئے ہیں۔ ہر کوئی اپنے ماضی پر فخر کر کے ایک دوسرے سے برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسے ماحول میں دنیا کو کشمیری تہذیب و ثقافت سے روبرو کرانے کی اشد ضرورت ہے جس میں نفرت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے صرف پیار و محبت اور آپسی بھائی چارہ ہے۔ اس تناظر میں پیش ہے افسانہ 'گدھ' کا یہ اقتباس:

''قبایلیوں نے جب کشمیر پر حملہ کیا تو وہ ہندوؤں کے گھروں کا پتہ پوچھنے لگے تب کشمیریوں میں سے ایک کشمیری سامنے آیا اور کہنے لگا کہ بابا یہ بڑے خان ہیں یہ ہمیں اور اسلام کو بچانے آئے ہیں۔ بوڑھا کمہار اب تک ان خونی درندوں کی بات نہیں سمجھ پایا تھا اور حیرت سے اس کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا تبھی اس کشمیری نے ہندو لفظ ترجمہ ''بٹ'' یعنی خاندان کہا اور پوچھا کہ اس کا بٹ خاندان سے کیا رشتہ ہے۔ کمہار نے بٹ سنتے ہی اشارے سے بتایا کہ وہاں پر ایک گھر ہے جن کو وہ اپنے مٹکے دیتا ہے جن کی پوجا ہوتی ہے۔ اتنا سن کر قبائلی کمہار کو آزاد کر کے اس گھر کی طرف دوڑتے ہوئے گئے لیکن کمہار اب تک ان کے مقاصد سے غافل تھا۔ ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد وہاں یکا یک ایسا کہرام مچا کہ پوری پہاڑی ہلنے لگی۔ چاروں طرف چیخیں گونجنے لگیں، بوڑھے کمہار نے چیخ کر اپنے بیٹے رسول کو آواز دی۔ رسول لاٹھی لے کر بٹ کے آنگن کی طرف لپکا مگر ایک گولی نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔ قبائیوں نے وہاں پہلے چاک پھوڑا' پھر گھڑوں، پیالوں اور ہانڈیوں کو توڑا۔ آخر میں انھوں نے پورے گاؤں کو جلا دیا۔ ہر طرف آگ کے شعلے اور دھواں اٹھنے لگا۔ بوڑھا کمہار اپنے بھائیوں کو جلتا دیکھ کر زمین پر گر پڑا۔''7

پریم ناتھ در نے اپنے افسانوں میں کشمیری عوام کی غریبی اور بے بسی کو بھی بیان کیا ہے ان کے افسانوں کا مطالعہ

www.urduacademyts.com

کر کے قاری کے ذہن میں کشمیر کی ایک الگ تصویر سامنے آتی ہے۔ان کے افسانوں کے متعلق سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''کشمیر جو بار باران کے افسانوں میں آتا ہے اپنی وہ جنت بدوش عظمتیں لیے ہوئے نہیں آتا جن سے رومانوں کا افسوں جگانے کے لیے فضا تیار ہوتی ہے بلکہ ان میں وہ غم آلود اور نشتر آگیں کسک بھرتا ہے جس سے ہم کشمیر کی حقیقت سے زیادہ قریب ہوجاتے ہیں اور وہ حقیقت یہاں کی ناداری، بھوک اور جاگیردارانہ غضب کا باریک مشاہدہ نظر آتا ہے۔ در کے موضوعات ہماری آس پاس کی زندگی اور اس سڑے ہوئے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں اوران میں زندگی اس قدر قریب محسوس ہوتی ہے جیسے ہمارے پاس سانس لے رہی ہو۔'' 8

پریم ناتھ در نے افسانوں کے علاوہ ایک ڈراما کشمیری زبان میں ''زگبرڑ'' (دو بیٹے) کےعنوان سے لکھا اس ڈرامے میں بھی ہندو اور مسلمانوں کی بھائی چارگی کو بیان کیا ہے۔ در اپنے ڈراما 'زگبرڑ' کے پیش لفظ میں اپنی کہانیوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت ہے کہ میری کہانیوں کی بڑی تحسین ہوئی اردو میں مگر سچ بات تو یہ ہے کہ جو کچھ میں لکھتا تھا اس میں کشمیر کا مٹھاس تھا دوسری زبان کے الفاظ میں غیر شعوری طور پر آبشاروں کی چھینٹیں اڑتی تھیں۔ پہاڑوں کی گودیوں میں مویشیوں کے ریوڑ اچھلتے کودتے دیواروں کے بیچ میں برف کے گولے مچلتے ہوئے آگرتے۔'دو بیٹے'' ایک ہندو اور ایک مسلمان ڈل کی سطح آب پر تیرتے ہوئے کھیت میں رقص کرتے اور اسی عمل میں میری تحریر اپنی شیرینی جذب کرتی ہے۔'' 9

آخر میں مختصر طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری میں وہ سبھی عناصر موجود ہیں جو ان کے افسانوں کو روشن کرتے ہیں۔ان کے یہاں جذبات نگاری کے ساتھ مقصدیت بھی ملتی ہے۔در نے کشمیر کی زندگی کو کافی قریب سے دیکھا تھا ،اسلیے انہوں نے اپنی کہانیوں کے کرداروں کو بہترین انداز میں پیش کیا اور مختلف مسائل سے دوچار ہونے کے بعد بھی قلم کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔

☆☆☆

حوالے:

1 جیالال ناظر، آج کل، کشمیر نمبر، دہلی، 1955، ص، 29
2 پریم ناتھ در، کشمیری شخصیت، آج کل، کشمیری نمبر، دہلی، 1955، ص، 17
3 پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، گیت کے چار بول (افسانہ)، راج ہنس پرکاشن، ص، 8 ' 4 پریم ناتھ در، کوفتہ، ص، 54
5 ایضاً، ص، 56 ' 6 پریم ناتھ در، گدھ، ص، 38
7 ایضاً، ص، 42 ' 8 پریم ناتھ در، گاغذ کا واسدیو، ص، 5
9 پریم ناتھ در، زگبرڑ، سری نگر، اکاڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، 1969، ص، 4

☆☆☆

سنیل کمار
115 ،جہلم ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی 110067
موبائل 8082675182

مضامین

www.urduacademyts.com

رشید احمد صدیقی سلیمان اطہر جاوید کی نظر میں

اردو ادب میں رشید احمد صدیقی ایک روشن باب ہے۔جس طرح غالبؔ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتا تو اس کے مکاتیب ہی کافی تھے اسے شہرتِ دوام بخشنے کے لیے۔اسی طرح رشید احمد صدیقی بھی اگر طنز و مزاح نگار نہ ہوتے تو ان کے خطوط کافی تھے انھیں ادب میں زندہ رکھنے کے لیے۔رشید احمد صدیقی صفِ اول کے طنز و مزاح نگار تھے۔ ان کے خاکوں خطوط اور دیگر تحریروں میں بھی ظرافت پائی جاتی ہے۔ان کا انداز تحریر اور اسلوب منفرد اور خواص پسند تھا انھوں نے اپنے اس معیار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ان کے اکثر مضامین میں ایسے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔جس طرح شاعر اپنی شاعری میں صنعتِ تلمیح کا استعمال کرتا ہے۔جس کے ذریعے پورا واقعہ پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ رشید صاحب کے مضامین میں بھی ایسے اشارے اور کنایے ملتے ہیں جس کو وہی قاری سمجھ پائے گا جس کا مطالعہ گہرا ہو ورنہ عام قاری تو اس بات کو سمجھ ہی نہیں پاتا کہ آخر وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

سلیمان اطہر جاوید دنیائے اردو ادب میں شاعر، نقاد، محقق، صحافی، مرقع نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن'' پر تحقیق ہے۔دراصل یہ جاوید صاحب کے پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے جو انھوں نے مسعود حسین خان کی زیرِ نگرانی مکمل کیا اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔اس مقالے کا پہلا ایڈیشن 1968ء میں شائع ہوا تھا اور 1976ء تک اس کی ساری کاپیاں ختم ہوچکی تھیں لیکن مانگ برابر جاری رہی اس لیے رشید احمد صدیقی کے دیگر شاگردوں سے ملاقات کر کے مزید معلومات جمع کرنے کے بعد اسے مزید بہتر انداز میں شائع کیا گیا۔علاوہ ازیں رشید صاحب کے بہت سے خطوط بھی اس میں جمع کئے گئے۔جاوید صاحب نے ارادہ کیا کہ مکاتیب رشید کے نام سے الگ سے ان کے خطوط ترتیب دیں گے۔بعد آپ نے ''مکاتیب رشید'' کے نام سے دو حصوں میں شائع کیا۔اس کتاب کا تعارف پروفیسر مسعود حسین خان جیسے نامور محقق نے تحریر کیا ہے۔جس میں رشید احمد صدیقی کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔اس میں رشید احمد صدیقی کا عہد، حالاتِ زندگی، رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ، طنز و مزاح، مرقع نگاری، تنقید، اسلوب، وغیرہ عناوین کے تحت بات کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مسعود حسین خان نے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ:

''رشید صاحب آدمی بھی ہیں انسان بھی، مرنجاں مرنج اور زود رنج، حساس اور زود حس، نظر کے کانٹے پر اشخاص کو سبک و گراں کرنے والے کسی نامعقول کو اپنی صحبت میں بار نہ دینے والے، ان کے مزاج کی بنیادی خصوصیت

www.urduacademyts.com

خواص پسندی ہے' اشخاص ہوں یا اشیاء ان کے انتخاب کا ایک معیار ہمیشہ برقرار رہتا ہے'' (ک: رشید احمد صدیقی: شخصیت اور فن ص:7)

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اس کے عہد کا جائزہ ضروری ہوتا ہے۔اس کے پیشِ نظر سلیمان اطہر جاوید نے سب سے پہلے ان کے عہد کا جائزہ لیا اور رشید احمد صدیقی کی شخصیت کے تشکیلی عناصر میں کیا کیا چیزیں کارفرما رہی ہیں ان کا بغور جائزہ لیا۔اس میں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے حوالے سے بہت سی بنیادی باتوں سے ہمیں واقف کرایا۔سرسید اور قوم کے تئیں ان کے خلوص' مسلمانوں کو ترقی یافتہ قوم بنانے کی فکر اور جذبے کے حوالے سے بہت سی باتیں پیش کیں۔سرسید کے مخالفین کا منھ توڑ جواب دیا جو یہ باور کرانے کی کوشش کررہے تھے کہ سرسید مسلمانوں کو عیسائی جیسا بنا نا چاہتے ہیں۔اگر وہ مسلمانوں کو عیسائی جیسا بنانا چاہتے تو ان کے لیے الگ کالج قائم کرنے کی تجویز کیوں پیش کرتے؟۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر مختلف اوقات میں جو مصیبتوں کے بادل منڈلایا کرتے تھے۔مختلف لوگ جو سازشیں کیا کرتے تھے ان تمام باتوں کا غیر جانب دارانہ انداز میں تفصیلی بیان اس بات میں ملتا ہے۔اسی باب سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گا:

''سرسید نے مسلمانوں کی بہبودی کے لیے مسلم یونیورسٹی قائم کی تھی لیکن موجودہ سیکولر دور حکومت میں جہاں کے مذہبی ثقافتی تعلیمی اداروں کو اپنے طور پر زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا آئینی حق حاصل ہے۔افسوس کہ اس یونیورسٹی کے کردار کو مسخ کرنے کی مختلف اوقات میں کوشش کی جاتی رہی ہے۔سیکولرزم کے دعوں اور مذہبی اعلانات کی روشنی میں ارباب اختیار کی ایسی کاروائیاں سوالیہ نشان بن جاتی ہیں''۔ (ایضاً' ص:63)

حالاتِ زندگی لکھتے ہوئے جاوید صاحب نے رشید احمد صدیقی کے جدامجد حضرت پیر ذکریا صاحب اور ان کے قصبے مڑیا ہوں سے بات شروع کی' ان کا شجرۂ نسب پیش کیا۔اس کے بعد ان کے والدین' بھائیوں کا تذکرہ کیا۔رشید احمد صدیقی کی تعلیم وتربیت کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔رشید احمد صدیقی کے ذہن کے بارے میں بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''رشید احمد صدیقی مشرقی ذہنیت کے حامل اور قدامت پرست ہیں۔انہوں نے ہمیشہ مذہبی رواداری اور وسیع النظری کا مظاہرہ کیا ہے۔تعصب سے ان کو دور کا بھی علاقہ نہیں۔ طنز وظرافت ان کی زندگی رہی ہے اپنی تحریروں ہی کو نہیں بلکہ اپنی نجی صحبتوں کو بھی وہ طنز کے نشتروں اور ظرافت کے پھولوں سے خوشگوار بنا دیتے ہیں' لیکن آج تک ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ ہندو معتقدات کے بارے میں ان کی زبان یا قلم سے کوئی ایک لفظ بھی نکلا ہو'' (ایضاً 'ص:70)

جاوید صاحب نے بہت بڑی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ایسی بات وہ اسی وقت کہہ سکتے ہیں جبکہ وہ رشید احمد

www.urduacademyts.com

صدیقی کی ساری تحریروں کا بنظر غائر مطالعہ کر چکے ہوں۔

ہائی اسکول کا امتحان کامیاب ہونے کے بعد ایک سال تک کلرکی کی۔اس کے بعد وہ علی گڑھ میں داخلہ لینے حاضر ہوگئے۔وہیں سے انہوں نے ایم۔اے کیا' اس دور میں علی گڑھ کی معاشرت کیسی تھی' اس کی تہذیب اور اس کے آداب کیسے تھے۔ان پر تفصیلی طور انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔لکھتے ہیں کہ:

''رشید احمد صدیقی کو ہر جگہ محبت اور اچھا ماحول ملا' والدین سے بھی زیادہ انہیں پیار ملا' بھائی بہنوں اسکول کالج کے دوست احباب سے بھی' علی گڑھ اقامتی تعلیم گاہ اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے مرکز توجہ ہونے کے باعث وہاں ہر طرح کے نوجوان مل جاتے ہیں۔کوئی طالب علم باہر نہیں جاتا۔جس کا جو مزاج ہوتا ہے اس کو اپنے مذاق کا ماحول مل جاتا ہے۔کوئی فرد خواہ کسی قماش کا ہو تہذیبی معیار گرنے نہیں دیتا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے کے لوگ شریفانہ آداب اپنے ساتھ لاتے تھے۔اس دور میں علی گڑھ کی معاشرت دراصل خلاصہ تھی اس معاشرت کا جو سرسید اپنے ساتھ لائے تھے اور اس سے کون انکار کرے گا کہ سرسید اپنے دور کی معاشرت کا مکمل نمائندہ تھے'' (ایضاً 'ص:74)

رشید احمد صدیقی شرافت' نیک نفسی اور حسن اخلاق کا خوبصورت نمونہ تھے۔انہوں نے اپنے نظریات کسی پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔اپنے عہدے کے زور پر کسی کو اپنے نقطۂ نظر کو مان لینے پر اصرار نہیں کیا۔انہوں نے جب تک شعبۂ اردو سے متعلق رہے کسی تحریک کا مرکز اسے بنے نہیں دیا۔رشید احمد صدیقی کے کامیاب شاگردوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا شمار ہوتا ہے۔جنہوں نے اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کے عنوان سے اپنے استاد کی نگرانی میں مقالہ تحریر کیا' اپنے استاد کے متعلق وہ یوں رقم طراز ہیں کہ:

''رشید صاحب کی ایک قابل ذکر اور قابل قدر خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص ادبی مسلک کے پابند ہوتے ہوئے بھی اپنے شاگردوں پر اسے عائد کرنے کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔چنانچہ میں نے جب یہ کام شروع کیا تو انہوں نے کہا کہ اس مقالے کی ترتیب و تحریر میں کامل طور پر آزاد ہوں البتہ تحقیق کے اصول و آداب سے غفلت نہ برتوں''۔ (خلیل الرحمٰن اعظمی' اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ مارچ ۱۹۷۲' ص:43)

شاگرد استاد کا عکس ہوا کرتا ہے اس لیے شاگرد کو دیکھ کر استاد کی صلاحیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔رشید احمد صدیقی کے شاگردوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے علاوہ' اسرار الحق مجاز' معین احسن جذبی' جاں نثار اختر اور اختر الایمان کا نام لیا جا سکتا ہے۔رشید صاحب سفر بے زار شخص تھے۔مسعود حسین خان کے نام لکھے گئے خط میں اپنی سفر بے زاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ تو آپ جانتے ہیں کہ کام ختم ہوتے ہی پہلی ٹرین سے حیدرآباد سے واپس ہوجانا چاہتا ہوں اس لیے کہیں بھی چائے یا کھانا یا خیر مقدمی کی تقریب ہونے مت دیجئے گا

www.urduacademyts.com

اس لیے کہ کسی میں شرکت نہیں کرسکوں گا'' (ایضاً' ص:88)

اس کے بعد مقالہ نگار نے رشید احمد صدیقی کی شادی' اولاد کی تفصیل' عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کی زندگی کے بارے میں لکھا تھا۔ نیز ان کے مزاج' عادات واطوار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔اس باب کا اختتام ان جملوں میں ہوتا ہے:

''ان حالات میں بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ رشید احمد صدیقی ان دنوں علی گڑھ کے خاموش تماشائی ہیں۔ایک عاشق بھی جس نے اپنے علی گڑھ کو پا کر بھی نہیں پایا'' (ایضاً ' ص:106) اس باب میں اور بھی دلچسپ اور پر لطف واقعات ہیں۔

اس کے بعد کا باب رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ ہے۔احباب اور اہلِ ادب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ رشید احمد صدیقی علی گڑھ کے عاشقِ صادق ہیں ۔ ان کی تحریروں میں علی گڑھ سے جو محبت' پیار جھلکتا ہے ۔ان تمام باتوں کا تذکرہ انہوں نے اس باب میں کھل کر کیا ہے۔ان کی تحریریں '' آشفتہ بیانی میری'' ہو یا کوئی دوسری تصنیف اس میں وہ علی گڑھ کا ذکر نہ کریں یہ ممکن نہیں ہے۔علی گڑھ سے محبت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''مجھے اپنی درس گاہ علی گڑھ سے محبت ہے جس نے مجھ میں اعلیٰ کو ادنیٰ سے تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کی اور اعلیٰ کو پانے اور ادنیٰ سے بچنے کا حوصلہ دیا''۔

اس کے بعد انہوں نے علی گڑھ سے وابستگی کے اجتماع اور انفرادی وجوہات پر روشنی ڈالی ہے۔ جہاں بھی موقع ملتا وہ علی گڑھ کی تعریف کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے بلکہ ہر جگہ دل کھول کر اس کی تعریف وتوصیف میں رطب اللّسان رہتے ہیں۔اس باب میں موصوف نے بہت عمدگی کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی کوشش کی اور بہت تفصیل کے ساتھ ان کی علی گڑھ سے عقیدت کو بیان کیا۔

اس باب کی ابتدا میں طنز ومزاح کی مبادیات کو سمجھانے اور ان پر بہترین انداز میں گفتگو کی گئی ہے ۔مضامینِ رشید اور خنداں کے ناموں سے ان کے طنز ومزاح کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔خنداں کے بارے میں بات کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

''خنداں رشید احمد صدیقی کے ریڈیائی مضامین کا مجموعہ ہے۔خنداں کا نمایاں وصف اس کے موضوعات کا تنوع ہے۔اس سے صرف اس امر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کا ذہن کتنا وسیع نظر کتنی عمیق ونیز زبان وبیان پر کس حد تک عبور ہے۔ (ایضاً' ص:161)

خاکہ نگاری یا مرقع نگاری کا فن اردو ادب میں انگریزی زبان کی دین ہے۔یہ فن سوانح نگاری سے بالکل الگ ہے۔سوانح نگاری جس شخص پر لکھی جاتی ہے صرف اس شخص کے تعلق سے معلومات فراہم کرتی ہے جب کہ مرقع نگاری ہمیں وہ مواد فراہم کرتی ہے جس کے ذریعہ کسی بھی فرد کا خاکہ ہمارے ذہن میں پوری طرح ابھر جاتا ہے۔یعنی معلومات کے ساتھ ساتھ خوبیوں اور خامیوں کا ذکر

www.urduacademyts.com

کرنا مرقع نگاری کی اہم خصوصیت ہے۔مرزا فرحت اللہ بیگ نے ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی''میں لکھا ہے۔

''جہاں مولوی صاحب کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا تا کہ اس سے مرحوم کی اصلی جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے اور چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کے لیے لکھی گئی ہو۔میں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا کیوں کہ یہ بناوٹ کی صورت ہے۔جس موقع پر جو کچھ سنایا دیکھا اس کو جوں کا توں لکھ دوں گا''
(ک:نذیراحمدکی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی ص:5)

رشید احمد صدیقی کا نام مرقع نگاری کے میدان میں بھی اپنی ممتاز شناخت رکھتا ہے۔''گنج ہائے گرامایہ'' (1937)''ہم نفسانِ رفتہ اور ذاکر صاحب'' (1962) ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔''آشفتہ بیانی میری'' شیخ نیازی اور مضامینِ رشید میں بھی مضامین کے ساتھ ساتھ مرقعے موجود ہیں۔رشید صدیقی کی مرقع نگاری کے تعلق سے پروفیسر جاوید رقم طراز ہیں کہ:

''رشید صدیقی عام طور پر طنز ومزاح نگار سمجھے جانے کے باوجود مرقع نگار کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں اور مرقع نگاری میں بھی بدرجہا کامیاب ہیں۔انھوں نے جس صنف یا موضوع پر قلم اٹھایا ہے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔مرقع نگاری کا بھی یہی حال ہے۔چونکہ مرقع نگاری کے لیے انشا پردازی کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لیے صاحب طرز ادیب ہونے کی وجہ سے رشید صدیقی کے خدوخال با آسانی ممیّز کیے جاسکتے ہیں۔(ایضاً ،ص:234)

مقالے کا ساتواں باب رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری کے متعلق بحث کرتا ہے۔مگر رشید احمد صدیقی باقاعدہ طور پر ایک نقاد تو نہیں تھے پھر بھی اردو شاعری اور اردو غزل کے متعلق ان کی رائے میں تنقیدی افکار کی جھلکیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔جیسا کہ غزل کو انہوں نے اردو شاعری کی آبرو کہا اور یہ بھی کہا کہ اگر کوئی پوچھے مجھ سے کہ مغلوں نے ہندوستان کو کیا دیا ہے تو میں یہ تین نام لوں گا''غالب اُردو اور تاج محل''۔ترقی پسندوں کے متعلق جو انھوں نے لکھا ہے کہیں نہ کہیں اس میں ان کے تنقیدی افکار آشکار ہوتے ہیں۔جاوید صاحب ان کی تنقید کے متعلق کہتے ہیں:

''رشید صدیقی کے نزدیک تنقید نہ یزداں کا فن ہے اور نہ اہرمن کا' یہ انسان کا فن ہے اور انسان کے بہترین کاموں کو پرکھنے کا فن۔ان کی تنقیدوں کے جائزے سے قبل یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انھیں بنیادی طور پر کس حد تک نقاد کہا جاسکتا ہے۔رشید صدیقی کا میدان طنز ومزاح کا ہے۔انھیں اردو کے ان چند طنز ومزاح نگاروں میں شامل کیا جاسکتا ہے جن سے اردو ادب میں طنز ومزاح کی آبرو قائم ہے اور خود اردو ادب کی بھی۔ان کے بارے میں سجاد ظہیر کی اس رائے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ''ان کے مزاج کی بے ساختہ مزاجیت اور قدامت پسندی انھیں ایک دلچسپ معلم

www.urduacademyts.com

اور مزاح نگار بنائے تو بنائے' ادب کی کسی بھی صنف کا پُر مغز نقاد بننے نہیں دیتی۔ رشید صدیقی نے بھی کبھی نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ (ایضاً' ص:281)

آخری باب میں جاوید صاحب نے رشید احمد صدیقی کے اسلوب کے تعلق سے بات کی ہے۔ جہاں تک میں نے انھیں پڑھا ہے ان کا اسلوب نہایت سلجھا ہوا' زبان صاف ستھری اور انھیں طنز و مزاح پیدا کرنے والے پہلوؤں پر قدرت حاصل تھی۔ ان کے اسلوب کی خامی یہ تھی کہ وہ بات کہتے کہتے قاری کو بھول بھلیوں کی سیر کراتے نظر آتے ہیں جو قاری کے لیے ایک دشوار کن مرحلہ ہوتا ہے۔ پھر وہ موضوع کی طرف آتے ہیں اور اپنی بات پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر تشنگی باقی رہتی ہے۔ اسلوب کے متعلق جاوید صاحب کی رائے ہے کہ:

''جس طرح بے اصولی بھی کبھی اصول بن جاتی ہے' بعینہ رشید صدیقی کی یہ بے ربطی بات میں بات پیدا کرنے کا انداز اور بہکنے کی عادت ایک اصول ایک ربط ایک تسلسل اور ایک قرار ہے۔ یہ خامی ہو یا خوبی یہ رشید صدیقی کا آرٹ ہے کیوں کہ اس بہک جانے کے انداز میں ہی وہ اسلوب پیدا کرتے ہیں' وہ بات میں بات پیدا کرتے ہوئے تہہ بہ تہہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی لفظیات کا سرمایہ گراں اور وقیع ہے۔ زبان پر ان کو مکمل قابو ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی تحریر میں جب اور جس طرح موڑ چاہے پیدا کر سکتے ہیں۔ اپنے اسی اسلوب سے وہ طنز و مزاح بھی پیدا کرتے ہیں۔ (ایضاً' ص:404)

مجموعی طور پر سلیمان اطہر جاوید کا یہ تحقیقی مقالہ ادبی دستاویز کا حامل ہے۔ جو کوئی رشید احمد صدیقی کے متعلق جاننا چاہتا ہے وہ اس مقالے سے استفادہ کر سکتا ہے۔

☆☆☆

سردار خواجہ معین الدین (سردار ساحل)
پی ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر' سی۔عبدالحکیم کالج'
میل وشارم' تمل ناڈو
لیکچرر شعبہ اردو' یوگی ویمنا یونیورسٹی' کڈپہ 516005
فون:9885348482

مضامین

مکھی کیوں پیدا کی گئی؟

خراسان کا بادشاہ شکار کھیل کر واپس آنے کے بعد تخت پر بیٹھا تھا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کے پاس ایک غلام ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا تھا۔ بادشاہ کو سخت نیند آئی ہوئی تھی مگر جب بھی اس کی آنکھیں بند ہوتیں تو ایک مکھی آ کر اس کی ناک پر بیٹھ جاتی تھی اور نیند اور بے خیالی کی وجہ سے بادشاہ غصے سے مکھی کو مارنے کی کوشش کرتا لیکن اس کا ہاتھ اپنے ہی چہرے پر پڑتا تھا اور وہ ہڑبڑا کر جاگ جاتا تھا۔ جب دو تین دفعہ ایسا ہوا تو بادشاہ نے غلام سے پوچھا' تمہیں پتہ ہے کہ اللہ نے مکھی کو کیوں پیدا کیا ہے' اس کی پیدائش میں اللہ کی کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ غلام نے بادشاہ کا یہ سوال سنا تو اس نے ایسا جواب دیا جو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ غلام نے جواب دیا'' بادشاہ سلامت! اللہ نے مکھی کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ بادشاہوں اور سلطانوں کو یہ احساس ہوتا رہے کہ وہ خود کو کہیں خدا نہ سمجھ بیٹھیں کیوں کہ وہ خود سے ایک مکھی کو بھی قابو نہیں کر سکتے۔''

ماخوذ

www.urduacademyts.com

اساتذہ - تبدیلی کے علم بردار

اساتذہ اگر باصلاحیت، تربیت یافتہ، ترغیب شدہ اور پرجوش ہوں تو وہ تبدیلی کے علم بردار ہو سکتے ہیں۔قوم وملک کی نئی نسل کا مستقبل سنوارنے والے اساتذہ ملک کا مستقبل سنوارنے میں بھی اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔اساتذہ بچوں کے ذریعہ جن اقدار کو فروغ دیتے ہیں، ان سے نہ صرف بہتر معاشرے کی راہ ہموار ہوتی ہے بلکہ قوم وملک کی ترقی میں بھی ان کا نمایاں رول ہوتا ہے۔چاہے علم کا چراغ روشن کرنے کا کام ہو یا بچوں کو ذمہ دار شہری بنانے کا کام، اساتذہ کئی حیثیتوں سے بڑے کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔اساتذہ ہی ہمارے بچوں کو علم و ہنر کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں، ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے ہیں، انہیں سماجی اقدار سے روشناس کرتے ہیں اوران کے ذریعہ بہتر اور صحت مند سماج کی تعمیر و تشکیل کے لیے کوشش کرتے ہیں۔

قدیم ہندوستان میں تدریس کو مقدس پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ اساتذہ کے خلوص اور ان کی قربانیوں کی وجہ سے ہندوستانی سماج میں انہیں نہایت ہی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ایک وقت تھا جب صرف قابل ترین لوگ ہی تدریس سے منسلک ہوتے جو تدریس کے ساتھ ہی بچوں کی بہترین تربیت بھی کرتے تھے۔ایسے اساتذہ بچوں کو علم و ہنر اور آداب معاشرت سکھانے کے ساتھ ہی ان میں اپنی گہری چھاپ چھوڑتے۔اساتذہ کرام انسانیت سازی اور سماج کے لیے دن رات محنت کرتے جس کی وجہ سے ان کا زبردست احترام ہوتا تھا۔شخصیت سازی اور کردار سازی ان کا بنیادی مقصد ہوتا۔سماج کے کامیاب ترین لوگ اپنے اساتذہ کی وجہ سے پہچانے جاتے جو اپنی کامیابی کا سہرا بھی اپنے اساتذہ کے سر باندھنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

صارفیت کے موجودہ دور میں خصوصاً برصغیر میں اساتذہ کا مرتبہ کم ہوا ہے۔اب سماج میں اساتذہ کا وہ مقام و مرتبہ نہیں رہا جو سو سال پہلے تک ہوا کرتا تھا۔اس کی بے شمار وجوہات ہیں۔ ہندوستان میں بے اثر تعلیم و تدریس کی بھی متعدد وجوہات ہیں۔ بعض ریاستی حکومتوں کے ذریعہ محض ڈگریوں کی بنیاد پر نوجوانوں کو درس و تدریس کی ذمہ داری سونپنے سے تعلیم کا زبردست نقصان ہوا ہے۔ گذشتہ برسوں میں متعدد ریاستی حکومتوں کی طرف سے ایسے لوگوں کو پڑھانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی ہے جو نہ تو صاحب علم ہیں اور نہ ہی تدریس کے تقاضوں سے واقف ہیں۔ملک میں ہزاروں اسکول و کالج ایسے ہیں جہاں باضابطہ تدریس و اکتساب کا معقول انتظام نہیں ہے۔اساتذہ تیار کرنے والے ناقص اداروں کی وجہ سے بھی تعلیم کا زبردست نقصان ہو رہا ہے۔متعدد ضلعی سطح کے تربیتی اداروں اور بیشتر پرائیویٹ اداروں کی طرف سے تربیت کا ایسا ناقص انتظام ہے کہ ان سے کردار سازی اور شخصیت سازی کی توقع بے کار ہے۔

www.urduacademyts.com

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایسے ادارے بھی سرکار کی طرف سے یا اس کی منظوری سے ہی چل رہے ہیں جہاں نہ صرف بنیادی ڈھانچے کی قلت ہے بلکہ تدریس واکتساب کے لیے موزوں اساتذہ بھی نہیں ہیں۔دوسری طرف بعض ایسے ادارے بھی ہیں جہاں بنیادی ڈھانچہ تو ہے مگر نہ تو تدریس واکتساب کے لیے سازگار ماحول ہے اور نہ ہی اساتذہ کے لیے کوئی پر کشش اجرت۔اگر حق وانصاف کی بات کریں تو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ جب اساتذہ کے لیے معقول تنخواہ اور بنیادی سہولیات کا فقدان ہو تو ان سے مثالی معلم بننے کی توقعہ کیسے رکھ سکتے ہیں۔اگر اساتذہ کو بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے مناسب تنخواہ وقت پر نہ دی جائے تو وہ تدریس کو مؤثر و نتیجہ خیز کیسے بنا سکتے ہیں۔اگر اساتذہ سے نئی نسل کی کردار سازی اور شخصیت سازی کا کام لینا ہے تو ان کی ضرورتوں کا بھی پورا خیال رکھنا ہوگا۔انہیں وہ ساری سہولتیں دی جانی چاہئیں جو ان کا حق ہے۔اساتذہ کا مستقبل خراب کر کے ان سے ایسی توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ ہمارے نونہالوں کا مستقبل سنوارنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگادیں۔انصاف کا تقاضہ ہے کہ اساتذہ کو وقت پر مناسب تنخواہ دی جائے، پڑھانے کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا جائے، اداروں کے بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنایا جائے، اور نتیجہ خیز تدریس واکتساب کے لیے معقول انتظام کیا جائے۔حکومت اور اداروں کی طرف سے مؤثر تدریس و اکتساب کا کارگر انتظام کیا جائے تو بعید نہیں کہ تعلیم وتدریس بھی مؤثر اور نتیجہ خیز ہو۔اکیسویں صدی میں بہترین اساتذہ اور اور نتیجہ خیز تدریس واکتساب کے لیے ایسا کیا کرنے کی ضرورت ہے اس پر پوری توجہ مبذول کرنا ضروری ہے۔ماضی کے تجربات کی روشنی میں غور کرنا ہوگا کہ معیاری تعلیم، بہترین تعلیمی ادارے، اساتذہ کی تعلیم اور کامیاب اساتذہ پیدا کرنے کے لیے حکومت اور سماج کو کیا کرنا ہوگا۔

نتیجہ خیز تدریس و اکتساب کے لیے اساتذہ کا باصلاحیت ہونا ضروری ہے۔اساتذہ کے لیے تعلیم یافتہ اور ہنرمند ہونے کے ساتھ ہی تربیت یافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر مضمون پر اچھی گرفت نہ ہو اور تدریسیات میں پیشہ ورانہ تربیت حاصل نہ کی ہو تو ایسے پیشہ ور لوگوں کو تبدیلی کا علم بردار سمجھنا بڑی بھول ہوگی۔ان سے ترغیب شدہ اور متاثر کن ہونے کی توقع بھی نہیں کر سکتے۔اساتذہ اگر اپنے پیشے سے محبت رکھنے کے ساتھ ہی طلبا کے ہمدرد اور خیر خواہ بھی ہوں، اپنے ادارہ اور گرد و پیش کے ماحول سے مانوس ہونے کے ساتھ ان سے انسیت رکھنے والے بھی ہوں تو ان سے بہتر کارکردگی کی امید کی جاسکتی ہے۔وہ ترغیب شدہ اور پر جوش بھی ہو سکتے ہیں اور تبدیلی کے علم بردار ثابت ہو سکتے ہیں۔

اساتذہ کے لیے اپنے طلبا کے لیے مشفق ومہربان ہونا تو ضروری ہے ہی، ساتھ ہی اولیائے طلبا سے بھی ان کے ہمدردانہ روابط ہوں اور وہ خصوصاً اس سماج کے تئیں مثبت فکر رکھنے والے ہوں جس میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔دوسری طرف سماج کو بھی اساتذہ کی خدمات کا اعتراف کرنا ہوگا۔اساتذہ کو احترام کی نظر سے دیکھا جائے۔سماج، طلبا

www.urduacademyts.com

اوراولیائے طلبا کے تعاون کے بغیر اچھے اساتذہ کی کارکردگی پر بھی منفی اثر پڑتا ہے۔جس طرح بچوں کے مؤثر اکتساب کے لیے اسکول، گھر اور سماج میں خوشگوار ماحول ضروری ہے، اسی طرح اچھی تدریس کے لیے بھی مناسب وسائل اور اطمینان بخش و پرسکون ماحول ناگزیر ہے۔مؤثر تدریس کے لیے جس طرح کے بنیادی ڈھانچے اور جن اکتسابی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، ان کو نظر انداز کر کے نتیجہ خیز تعلیم کی امیدیں باندھنا مناسب نہیں۔ آزادی کے ۷۳ سال بعد بھی ملک میں ایسے اسکول موجود ہیں جہاں فرنیچر کا فقدان ہے اور ضرورت کے مطابق کلاس روم تک نہیں ہیں۔ملک میں ایسے اسکولوں کی کمی نہیں ہے جہاں ایک کمرے میں ایک ساتھ کئی کلاسیس چلتے ہیں۔ہمارے ملک میں واحد معلم والے اسکولوں کی بھی کمی نہیں ہے جہاں ایک ہی معلم کو پورے اسکول کے کئی کلاسوں کو پڑھانے کی ذمہ داری دی جاتی ہے۔

اساتذہ کو غیر تدریسی کاموں میں الجھائے رکھنا ایک بڑا مسئلہ ہے۔اساتذہ سے صرف وہ کام لیا جائے جس کے لیے ان کی تقرری ہوئی ہے۔نہ تو ان کے اوپر حد سے زیادہ بوجھ ڈالا جائے اور نہ ہی انہیں ایسی آزادی دی جائے کہ وہ پڑھانے سے لاپرواہو جائیں۔ماحول کچھ اس طرح کا قائم کیا جانا چاہیے کہ اساتذہ کی کوتاہی اور کمیاں سماج اور حکومت کی نظر میں آجائیں۔انہیں خامیوں اور کوتاہیوں کے لیے جواب دہ بنایا جائے۔ساتھ ہی انہیں ایسا موقع بھی دیا جانا چاہیے کہ وہ خود کو بہتر بنا سکیں، بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے ان کی کوششوں کی ستائش ضروری ہے۔انہیں مسلسل پیشہ ورانہ ترقی کا بھرپور موقع دیا جائے تاکہ وہ نت نئی چیزوں سے واقفیت حاصل کرتے رہیں اور اپنے اداروں میں ان کا اطلاق بھی کر سکیں۔جس طرح اساتذہ اپنے طلبا کی مخفی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں کوشاں رہتے ہیں، اسی طرح اساتذہ کو بھی اپنی تدریسی صلاحیتوں کا خاطر خواہ استعمال کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔اسکول مینجمنٹ اور پرنسپل کی طرف سے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ اسکول کا ماحول طلبا کے ساتھ اساتذہ کے لیے بھی اطمینان بخش ہو جہاں انہیں کھل کر پوری آزادی کے ساتھ درس و تدریس کے ذریعہ سماج میں بڑی تبدیلیاں لانے کا موقع مل سکے۔

جن اسکولوں میں اساتذہ اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں وہاں کا ماحول نہ صرف درس و تدریس کے لیے موزوں و موافق ہو بلکہ ادارہ کے جملہ اراکین کے لیے بھی سازگار ماحول ہونا ضروری ہے۔اساتذہ خوشگوار ماحول میں ہی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں، جہاں ان میں خوب سے خوب تر کرنے کا جذبہ فروغ پا سکتا ہے، اوران کے رویے میں مثبت تبدیلی آسکتی ہے۔اس ضمن میں پرنسپل، اسکول مینجمنٹ اور سماج کی ذمے داری بڑھ جاتی ہے۔ حکومت کو بھی اساتذہ کو ملنے والی سہولیات کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔اگر اساتذہ کی بہترین کارکردگی کے باوجود انہیں وہ سب کچھ نہیں ملتا جن کے وہ مستحق ہیں تو اس سے نہ صرف ان کی حوصلہ شکنی ہوگی بلکہ کارکردگی پر بھی منفی اثر پڑ سکتا ہے۔

مزید برآں، ہمیں اساتذہ کو درپیش مسائل اور

www.urduacademyts.com

اساتذہ کی مسلسل پیشہ ورانہ تربیت میں حائل رکاوٹوں پر بھی گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ عام اساتذہ کو بہترین و مؤثر اساتذہ بنانے میں ہمیں کامیابی کیوں نہیں مل رہی ہے اس پہلو پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ آج بھی تعلیم وتدریس کے لیے سب سے اچھے دماغ والے طلبا کو راغب کرنے میں ہم ناکام ہیں۔ حکومت کی طرف سے ایسی کوئی پیش قدمی نہیں ہو رہی ہے جس سے تعلیمی اداروں کے سب سے ذہین طلبا کو تدریس کے مقدس پیشہ سے منسلک ہونے کے لیے راغب کیا جا سکے۔ اساتذہ کی تقرری کے لیے جو ریاستی اور قومی سطح پر معلم اہلیتی جانچ منعقد کی جاتی ہے، یا اساتذہ کی تقرری کے لیے جو مقابلہ جاتی امتحانات ہوتے ہیں، ان کا مؤثر درس وتدریس سے کوئی راست تعلق نہیں ہوتا۔ پر اثر انداز میں پڑھانے کی اہلیت کی نہ تو بھر پور جانچ ہوتی ہے اور نہ ہی قاعدے سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا متعلقہ شخص بہترین معلم بننے کے لائق ہے بھی یا نہیں۔

اسی طرح اساتذہ تیار کرنے والے تربیتی اداروں کی حالت بھی بہت اچھی نہیں ہے۔ ملک میں ایسے اداروں کی تعداد تقریباً سترہ ہزار ہے جن میں ۹۲ فی صد ادارے پرائیویٹ ہیں۔ خاص طور پر اساتذہ کی تربیت سے متعلق بیشتر پرائیویٹ تعلیمی اداروں کا عمومی مقصد دولت کمانا ہوتا ہے۔ انہیں تعلیمی صنعت کی تجارتی دکانیں تصور کر سکتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر نجی اداروں میں نہ تو کورس کی بنیادی ضرورتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور نہ ہی مؤثر انداز میں نصاب کی تکمیل ہو پاتی ہے۔ ایسے اداروں سے ڈگریاں حاصل کرنے میں پیسے کا کمال ہوتا ہے۔ غیر کارکرد ٹریننگ کالجوں میں بھلا تبدیلی کے علم بردار اساتذہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس پہلو پر حکومت کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق آج بھی ہندوستان میں اساتذہ کی ہزاروں اسامیاں خالی پڑی ہیں۔ خصوصاً دیہی علاقوں میں صورت حال اور خراب ہے۔ دیہی علاقوں میں واقع اسکولوں میں تمام مضامین پڑھانے والے اساتذہ نہیں ہیں۔ ان اسکولوں میں زبان وادب پڑھانے والے اساتذہ کی بھی زبردست قلت ہے۔ سرکاری اسکولوں کے مسائل مختلف ریاستوں میں مختلف نوعیت کے ہیں۔ کہیں بنیادی ڈھانچہ نہیں ہے، کہیں پینے کے پانی تک کا معقول انتظام نہیں ہے، کہیں صاف ستھرے بیت الخلا کا ناقص انتظام ہے اور کہیں بجلی کا کنکشن تک نہیں ہے۔ سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کا وقت بے وقت تبادلہ بھی تعلیم وتدریس کے ماحول کو متاثر کرتا ہے۔

برسر خدمت اساتذہ کی مسلسل پیشہ ورانہ تربیت کا معقول انتظام نہ ہونا بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس طرح کے تربیتی پروگراموں کا انتظام اساتذہ کی ضرورتوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ عام طور پر مسلسل پیشہ ورانہ تربیتی پروگرام ہر ریاست کی علاقائی زبان میں منعقد کیا جاتا ہے۔ مثلاً شمالی ہند کی ریاستوں کے اساتذہ کا تربیتی پروگرام ہندی زبان میں، مہاراشٹر کے اساتذہ کا پروگرام مراٹھی زبان میں، کرناٹک کے اساتذہ کا تربیتی پروگرام کنڑ زبان میں اور کیرالا کے اساتذہ کا پروگرام ملیالم میں ہوتا ہے۔ اس سے پیشہ ورانہ تربیتی پروگراموں کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور وہ مقصد فوت ہو جاتا ہے جس کے لیے اساتذہ کے مسلسل پیشہ ورانہ تربیتی پروگراموں کو ناگزیر قرار دیا گیا ہے۔ قاعدے سے برسر خدمت اساتذہ کا

www.urduacademyts.com

تربیتی پروگرام ان کے تدریسی مسائل کا حل نکالنے کے لیے کیا جانا چاہیے۔ ہر زبان کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے۔ اردو اساتذہ اور اردو ذریعہ تعلیم کے اساتذہ کا مسلسل پیشہ ورانہ تربیتی پروگرام صرف اردو میں منعقد کیا جانا چاہیے۔

پیشہ تدریس کے وقار کو بحال کرنے، ملک بھر میں معیاری تعلیم اور پر اثر تدریس کو یقینی بنانے کے لیے معیاری اساتذہ تیار کرنا سب سے اہم اور چیلنجوں سے بھرا ہوا کام ہے۔ اساتذہ کی تعلیم کا بہتر انتظام کرنے کے ساتھ ہی برسرخدمت اساتذہ کی مسلسل پیشہ ورانہ تربیت پر بھی توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ اساتذہ کے ساتھ ہی سماج، مرکزی اور ریاستی حکومتیں اور تعلیمی اداروں کے ذمہ داران اساتذہ کے وقار کو بلند کرنے میں نمایاں رول ادا کرسکتے ہیں۔

اساتذہ طلبا کی کردار سازی اور شخصیت سازی کے ذریعہ قوم وملک کے لیے بہت بڑا کام کرسکتے ہیں۔ عام طور پر ابتدائی جماعتوں کے طلبا اپنے والدین سے زیادہ اساتذہ کی باتوں کو بہتر اور کارآمد سمجھتے ہیں۔ اساتذہ کے ذریعہ طلبا میں جو اقدار منتقل ہوتے ہیں، ان سے بچوں کو اچھی شخصیت بنانے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اساتذہ جن اصولوں کی پیروی کرتے ہیں، طلبا کے ساتھ ان کے رویے اور باہمی رشتے کی وجہ سے ان اصولوں کے اثرات بچوں میں مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے معلمین کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ بچوں کی کردار سازی کا بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے اساتذہ غیر ضروری چیزوں سے بچ سکتے ہیں جو انجانے میں کسی بھی انسان سے سرزد ہوجاتی ہیں۔ اچھے اور نیک انسان بننے کے لیے جن اصولوں پر چلنے کی ضرورت ہوتی ہے، انہی اصولوں پر چل کر ایک اچھا انسان بہترین معلم بھی بن سکتا ہے۔ سچائی، ایمانداری، صفائی، وقت کی پابندی، صاف گوئی و راست گوئی، حق کا ساتھ باطل سے دوری، قناعت پسندی، بلند ہمتی جیسی اقدار کی پیروی کرکے ایک انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں عزت واحترام کی زندگی گزار سکتا ہے۔ یہی اقدار اگر معلم کے ذریعہ طلبا میں منتقل ہوجائیں تو بہتر اور صحت مند سماج کی تشکیل کے لیے اساتذہ کا سماج پر بڑا احسان ہوگا۔

دنیا بھر کے اساتذہ چاہیں تو وہ اپنے طلبا کے ذریعہ دنیا کو نیا رخ دے سکتے ہیں۔ جیسے ہر انسان اپنی اولاد کو نیک اور صالح بنانے اور ان کے روشن مستقبل کے لیے حتی المقدور کوشش کرتا ہے، اگر اسی طرح اساتذہ بھی اپنے طلبا کے ذریعہ دنیا کو سنوارنے کا تہیہ کرلیں تو سماج سے برائیاں ختم ہونے لگیں گی، اچھے عالمی شہری پیدا ہوں گے، صحت مند و مہذب سماج کی تعمیر و تشکیل ہوگی اور حق تلفیوں کا سلسلہ ختم ہوگا۔ اساتذہ کا اگر استحصال ہو رہا ہے تو وہ عہد کرلیں کہ وہ کسی کے استحصال کا ذریعہ ہرگز نہیں بنیں گے۔ انہیں اجرت کے طور پر جو کچھ ملتا ہے اس سے زیادہ ملنے والے اجر پر یقین رکھیں۔ بس چراغ سے چراغ جلتا رہے۔ روشنیوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر مصباح انظر
اسسٹنٹ پروفیسر، مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذہ اردو ذریعہ تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باؤلی حیدرآباد 500032

www.urduacademyts.com

بے کسی حد سے جب گذر جائے

اُن کی کار آگے جا کر رُک گئی۔ سامنے مٹی کے بڑے بڑے ڈھیر پڑے تھے۔ وہاں بلدیہ والوں نے نالہ صاف کرنے کے لئے کھدائی کی تھی اور مٹی کے ڈھیر ویسے ہی چھوڑ دیے تھے۔ اس کے علاوہ ایک عمارت بھی بن رہی تھی جس کا تعمیری سامان اور ملبہ ریت' پتھر اطراف کناروں پر پڑے تھے۔ جس کی وجہ سے راستہ تنگ ہوگیا تھا۔ گلی کے اطراف چھوٹی چھوٹی دکانیں' سامنے خونچے والے' آئیس کریم کی بنڈی' بچوں کا شوروغل' راہگیروں کی آمد و رفت۔ یہ سب مل کر مچھلی مارکٹ کا منظر پیش کر رہے تھے۔ منصور کے ساتھ اس کا دوست فہیم بھی تھا۔ اس نے کہا راستہ بند ہے' کار تو جاسکتی نہیں۔ اندر گلی میں ستار صاحب سے ملنا بھی ضروری ہے۔ چلو پیدل ہی چلتے ہیں۔

وہ دونوں گلی میں داخل ہو گئے۔ میل کچیل سے بھری چھوٹی چھوٹی دُکانیں تھیں' باسی ترکاریوں کی بنڈیاں کھڑی تھیں۔ غریب لوگ بڑی دکانوں میں جانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ وہ یہیں سے سستے داموں میں اپنی ضرورت کا سامان خرید لیتے۔ جابجا گندگی کے ڈھیر تھے۔ کوڑا کرکٹ گھروں کے باہر پھینک دیا جاتا۔ کبھی کبھی بلدیہ کی گاڑی آجاتی کچرا اُٹھانے۔ دوسرے دن پھر وہی تعفن۔ پرانا علاقہ تھا۔ یہ غریب بستی تھی' یہاں کچے مکانات بنے تھے۔ جہاں مختصر سے ایک گھر میں آٹھ دس لوگ رہتے تھے۔

یہ لوگ کنارے کنارے چلتے رہے۔ اچانک منصور کی نظر ایک کچے مکان پر پڑی۔ ایک لڑکی معمولی لباس پہنے ترکاری والے سے ترکاری خرید رہی تھی۔ منصور نے غور سے دیکھا۔ وہ لڑکی معمولی لباس میں ہونے کے باوجود نہایت دلکش تھی۔ سنہرے بال کمر کو چھو رہے تھے۔ منصور اس لڑکی کو دیکھتے ہی ہوش کھو بیٹھا۔ وہ وہیں ٹھیر گیا۔

کیا ہوا منصور۔ آگے چلو۔ بس تھوڑی دور پر ستار صاحب کا مکان ہے فہیم نے کہا۔

منصور تو کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا اس لڑکی میں ضرور کچھ بات ہے۔ دل کہہ رہا تھا کہ بس یہی لڑکی میری شریک حیات بنے گی۔ غریب ہے تو کیا ہوا۔ ہر لحاظ سے اچھی لگ رہی ہے۔

''فہیم! تم نے دیکھا اُس لڑکی کو۔ وہ سامنے جو ترکاری لے رہی ہے۔ مجھے وہ لڑکی بہت پسند آگئی اور میں اس کو اپنی بیوی ضرور بناؤں گا۔'' کیا کہہ رہے ہو منصور۔

اتنا بڑا فیصلہ منٹوں میں کیسے کر سکتے ہو؟

جس خاندان سے تم تعلق رکھتے ہو' وہ خاندان تمھیں اس بات کی اجازت کبھی نہیں دے گا کہ تم کسی معمولی گھرانے کی لڑکی سے شادی کرو۔ تمھاری ممی تو اس معاملے میں بہت با اصول ہیں۔ وہ تمھاری شادی اپنے سے اونچے یا ہم پلہ خاندان میں ہی کرنا چاہیں گی۔ اُس کا خیال دل سے

www.urduacademyts.com

نکال دو۔ یہ ایک نظر کی محبت دیرپا نہیں ہوتی۔ یاد رکھو ہر چمکدار شئے سونا نہیں ہوتی۔ اُس کے اور تمھارے ماحول میں بہت بڑا فرق ہے اور تم یہ فرق کبھی نہیں مٹا سکتے۔

''میں نہیں مانتا اس فرق کو۔ منصور نے کہا۔

تم مانو یا نہ مانو۔ تمھارے گھر والے تو اس فرق کو ضرور مانیں گے۔ اُس کا رہن سہن، خیالات، طور طریقے کس طرح بدلے جاسکتے ہیں۔ فہیم بولا ''جب وہ ہمارے گھر آجائے گی تو ضرور Adjust ہو جائے گی۔ اور رفتہ رفتہ ہمارے گھر کے طور طریقہ بھی سیکھ جائے گی۔ منصور نے یقین سے کہا تم تو اس لڑکی سے ملے نہیں۔ پھر کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ تمھارے ماحول میں گھل مل جائے گی۔

ملنے جلنے اور راہ رسم پیدا کرنے کے بعد ہی تم یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ وہ کس فطرت کی لڑکی ہے۔

''میں ضرور اس لڑکی سے ملوں گا۔ منصور نے کہا۔

اسکے بعد سے منصور ہر دوسرے تیسرے روز شاہینہ کے گھر کے چکر لگاتا۔ شاہینہ دیکھتی کہ یہ لڑکا روزانہ گھر کے سامنے ہی ٹھیرتا ہے۔ منصور شاہینہ سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہ اکڑ کر نکل جاتی۔ رفتہ رفتہ منصور نے شاہینہ کے بھائی سے بات کر کے گھر کے حالات معلوم کئے۔

انتہائی غربت کے ماحول میں پلے اس خاندان کا واحد کفیل اُس کا باپ تھا جو معمولی محنت مزدوری کر کے اپنے خاندان کا پیٹ پال رہا تھا۔ منصور لڑکے کے کہنے پر گھر کے اندر آیا۔ درودیوار سے مفلسی ٹپک رہی تھی۔ ایک چھوٹے سے اسٹول پر وہ بیٹھ گیا۔ کہاں نرم نرم صوفوں پر بیٹھنے کی عادت اور کہاں یہ اسٹول لیکن وہ لڑکی کی محبت میں سب کچھ بھول گیا۔ اپنا عالیشان مکان، وہ عیش آرام کی زندگی۔ اب وہ اکثر شاہینہ کے پاس بیٹھتا اور زیادہ وقت وہیں گذارتا۔

شاہینہ اپنی غریبی کے باوجود ایک نہایت حساس لڑکی تھی۔ وہ طبقاتی فرق کو بخوبی سمجھتی تھی۔ وہ اداسی سے کہتی۔ آپ کے اور میرے ماحول میں بہت بڑا فرق ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ آپ کے گھر والے مجھے قبول کریں گے۔

''تم فکر نہ کرو۔ تمھارے اور میرے درمیان جو طبقاتی فرق ہے میں اُسے مٹا کر رہوں گا۔ ممی کو میری بات ماننی ہوگی''۔

منصور آپ کے اونچے گھرانے میں مجھ جیسی نچلے طبقہ کی لڑکی کے لئے گنجائش نکل سکے گی؟

تم یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ منصور نے کہا۔

منصور گھر میں سب کے چہیتے تھے۔ ان کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ نہ فکر معاش نہ غم دوراں۔ عیش سے زندگی گذر رہی تھی۔ گھر میں سب سے چھوٹے تھے۔ سب کچھ بلاضرورت مل جاتا تھا۔ لیکن اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق انہیں حاصل نہ تھا۔ والدہ سلیمہ بیگم بااصول بارعب شخصیت کی مالک تھیں۔ گھر میں اُن ہی کا حکم چلتا تھا۔ جن کی شان وشوکت، جلال اور وجاہت ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

منصور کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی ماں سے بات

www.urduacademyts.com

کرنے۔ اسلئے ماں سے کچھ کہنے سے پہلے انہوں نے بڑے بھائی سے اپنی خواہش بیان کی۔

بڑے بھائی بھڑک اٹھے۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ کم از کم خاندان کی عزت کا تو خیال کیا ہوتا۔

''کیا سوچ کر تم اس کنگال خاندان کی لڑکی کو گھر لانا چاہتے ہو۔ جو نہ ہماری تہذیب کلچر اور نہ ہمارے خاندان کی برابری کرسکتی ہے۔ آفس کے اور ہمارے گھرانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ گندے ماحول کی لڑکی کو گھر کی بہو بنا کر ماحول گندہ کرنا چاہتے ہو؟

بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں تمھیں اتنا ناعقبت اندیش نہیں سمجھتا تھا۔

''مگر بھیا۔

تم صرف جذباتی ہوکر سوچ رہے ہو۔ وقتی طور پر تو ایسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ لیکن جب عملی زندگی میں اُن سے واسطہ پڑ گیا تو بہت پچھتاؤ گے۔

''کیا وہ انسان نہیں ہیں۔ منصور نے کہا۔ کیا مفلس ہونا گناہ ہے؟

''انسان تو سب ہی ہوتے ہیں۔ اچھے برے۔ لیکن طبقاتی فرق کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایسی لڑکیوں کی سوچ اور ذہنیت ان کے ماحول کے حساب سے محدود ہوتی ہے۔ ہمیشہ خاندانی مساوات کو سامنے رکھ کر شادی کرنا چاہیے۔

کیا تمھارے لئے لڑکیوں کی کمی ہے؟ ایک سے اعلیٰ ایک خاندان کی لڑکی موجود ہے۔ بہن نے کہا۔ تم اس لڑکی کا خیال بھی دل سے نکال دو۔ جو تم سوچ رہے ہو وہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ کیا تم اپنے خاندان کی جگ ہنسائی چاہتے ہو۔

بھائی بہن سب مخالف تھے۔

ایک دن دل سے مجبور ہوکر وہ ماں کے پاس آئے۔

ممی کیا آپ کو میری خوشی عزیز ہے؟ کیا آپ میری خاطر اپنے اصول، خاندانی وقار کی پروا نہ کرتے ہوئے میری خواہش پوری کرسکتی ہیں؟

سلیمہ بیگم نے انہیں غور سے دیکھا۔

یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

ممی میں ایک ایسی لڑکی کو اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہوں جو نہایت مفلس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

انہوں نے سب کچھ سچ سچ بتادیا کہ وہ لڑکی کس طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔

ممی نے اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تم ہمارا خون ہو۔ تم نے یہ بات سوچی بھی کیسے؟''

کیا خاندان کی عزت کا بھی تمھیں خیال نہیں ہے؟ معمولی جھونپڑی میں رہنے والی لڑکی کو میں کبھی اپنی بہو نہیں بنا سکتی۔ خبردار۔ آئندہ اس بارے میں مجھ سے بات نہ کرنا۔ میں نے تمھارے لئے مشہور بزنس مین ساحل انصاری کی لڑکی

www.urduacademyts.com

پسند کی ہے۔ تمھیں پتہ ہے ان کی لڑکی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ شاندار خاندانی پس منظر رکھتی ہے۔ دولت تو ان کے گھر کی باندی ہے۔ اتنا اچھا رشتہ چھوڑ کر میں گندی گلی کوچوں کی سڑاند میں رہنے والی معمولی لڑکی سے رشتہ جوڑوں؟ نہیں نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔

کافی دن گذر گئے۔ ممی کسی صورت مانتی ہی نہ تھیں۔

ادھر منصور شاہینہ سے روز ملتا۔ اسے یقین دلاتا کہ میں صرف اور صرف تم سے ہی شادی کروں گا۔ ممی کو ماننا ہی پڑے گا۔ ممی ذرا سخت ہیں لیکن پھر بھی میں پرُامید ہوں۔

اُس نے پھر ممی کو منانے کی کوشش کی۔ خوب بحث وتکرار۔ نہ ممی مانتی تھیں نہ منصور اپنا فیصلہ بدلنے پر راضی۔ منصور نے آخری حربہ کا استعمال کیا۔ نا ماننے کی صورت میں اپنی من مانی کرنے کی دھمکی دی۔

بہت مجبور ہوکر ممی نے اجازت دے دی۔ گھر کے تمام افراد ناخوش تھے لیکن منصور کے تو دل کی مراد برآئی تھی۔ اس نے سوچا رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

منصور کی شادی شاہینہ سے نہایت سادگی اور خاموشی سے انجام پائی۔ صرف گھر کے اور قریبی رشتہ داروں نے شرکت کی۔ ہر ایک کی زبان پر لڑکی کی مفلسی ہی کی داستان تھی۔

ماں تو ابتداء سے ہی اس رشتہ کے خلاف تھیں۔ اُن کی تمام خواہشات اور آرزوؤں پر پانی پھر گیا تھا۔ بیٹے کی ضد کے آگے مجبور ہوکر انہوں نے اجازت دی۔ بصورت دیگر وہ اگر من مانی پر اتر آتا تو ان کے خاندانی وقار کو ٹھیس پہنچتی۔

غم وغصہ سے انہوں نے دلہن کا منہ بھی نہ دیکھا۔ دوست احباب اور عزیزوں کی موجودگی میں انہیں بڑی سبکی محسوس ہورہی تھی۔

یہی منصور جو کل تک اُن کا پلو پکڑے پھرتا تھا۔ آج کتنا خودسر ہوگیا تھا۔ کتنے خواب سجائے تھے انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے لاڈلے بیٹے کی شادی کے۔ سب کچھ دھرا رہ گیا۔ سارے سپنے اس لڑکی نے توڑ دیئے۔ ساحل انصاری کی بیٹی اس گھر میں آتی تو خوشی کے شادیانے بجتے۔ ایسی کیا بات ہے اس لڑکی میں جو منصور اس کے دیوانے ہوگئے۔

اس لڑکی سے ان کی نفرت دن بدن بڑھتی گئی۔ منصور کی ممی نے شاہینہ کو کبھی بہو نہیں سمجھا۔ اسے اپنے سامنے آنے سے بھی منع کردیا۔ اگر وہ سامنے سے گذر جاتی تو نفرت سے منہ پھیر لیتی۔

اس کے اٹھنے بیٹھنے پر بھی پابندی عائد کردی تھی۔ اگر وہ گھر کا کوئی کام کرنا چاہتی تو اُسے سختی سے منع کردیتیں۔ جیسے وہ اچھوت ہو۔

دن بدن ان کی نفرت کا زہر بڑھتا جارہا تھا۔ شاہینہ خاموشی سے سب برداشت کرتی۔ وہ منصور کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ منصور نے اس سے شادی کرکے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔ وہ اس کی احسان مند تھی۔ اُس نے گھر والوں کو اپنی ضد کے آگے جھکا دیا تھا۔

www.urduacademyts.com

شاہینہ حد سے زیادہ حساس لڑکی تھی۔ صبح سے شام تک وہ ممی کے طعنے طنز سنتی' ان کی جھڑکیاں سنتی۔ پھر بھی منصور کی محبت میں وہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے خاموش تھی۔

ایک دن تو حد ہوگئی۔ گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ شاہینہ نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اتنے میں ممی آگئیں۔ اور چلا کر بولیں۔ اے جھونپڑ پٹی کی لڑکی تو یہاں کیا کررہی ہے؟ چل جا اپنے کمرے میں۔

شاہینہ کو بہت تکلیف پہنچی۔ اپنی بے عزتی برداشت نہ ہوئی۔ کمرے میں پہنچ کر وہ اپنے ناکردہ گناہ کی سزا پر خوب روئی۔ کیا گناہ کیا تھا اس نے۔ کیوں مجھے یہ لوگ قبول نہیں کرتے۔ خصوصاً ساس کے منہ سے تو صرف شعلے ہی نکلتے ہیں۔ آتے جاتے مجھے ''نچلے طبقہ'' کی یاد دلاتی ہے۔

پھر سوچتی میں نے غلط فیصلہ لیا تھا۔ مجھے طبقاتی فرق کو سمجھنا چاہیے تھا۔ میں تو منصور کی محبت میں سب کچھ بھول گئی تھی۔ یہاں آکر مجھے کیا ملا؟ سوائے دُکھ' طنز کے تیر۔ کوئی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ اگر منصور کی محبت مجھے حاصل نہ ہوتی تو میں کب کی یہاں سے چلی گئی ہوتی۔

رات کو منصور کے آفس میں ضروری میٹنگ تھی۔ وہ دیر سے آنے کا کہہ گئے تھے۔ شاہینہ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ نیچے اُتری۔ نیچے ممی کا کمرہ تھا۔ اس کے سامنے سے گذرتے ہوئے اُس نے ممی کی آواز سنی جو اس کا نام لے کر کچھ کہہ رہی تھیں۔ شاہینہ کو فکر ہوئی کہ میرا نام کیوں لیا جارہا ہے۔ کمرے میں منصور کے بڑے بھائی اور بھاوج بھی موجود تھے۔ ہمیں منصور کی دوسری شادی کرنی ہی ہوگی۔

ممی کی آواز اس کے کانوں میں ہتھوڑے کی طرح پڑی۔ وہ چونک گئی۔ ممی کہہ رہی تھیں اب میں منصور سے بات کروں گی۔ ایک بات ایک ضد تو میں نے اس کی مان لی۔ اب وہ میری بات ماننے سے کیسے انکار کرے گا؟ انصاری صاحب سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی لڑکی کی شادی منصور سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گنوار جاہل لڑکی۔ نہ کسی کے گھر جانے کے لائق نہ منصور کے شانہ بہ شانہ چلنے کے قابل۔ اُس کو بہو بنا کر تو ہم کسی سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہے۔ منصور پر نہ جانے کیا جادو کر دیا تھا کہ وہ مجنون بن گیا تھا۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اس کی ضد پوری کرنی پڑی۔ اپنے خاندانی وقار و عزت کی قربانی دے کر۔

اب یہ محبت کا نشہ جلد ہی اتر جائے گا۔ جب وہ خوبصورت خاندانی لڑکی سے شادی کرے گا جو سارے خاندان کے لئے باعث افتخار ہوگی اور اس جاہل مفلسی کے بورے کو میں جلد ہی باہر پھنکوادوں گی۔

انصاری صاحب نے پرسوں شام کا وقت دیا ہے۔ تم سب تیار رہنا۔ تب تک میں منصور سے بات کرتی ہوں۔ اس سے اپنی بات منوا کر ہی رہوں گی۔

شاہینہ کے دل و دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ دل ڈوبنے لگا' دماغ ماؤف ہوگیا۔ وہ منصور کی محبت میں سب کچھ برداشت کررہی تھی لیکن اب منصور سے جدائی اور دوسری عورت کو وہ کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔

www.urduacademyts.com

رات پھر وہ کانٹوں پر لوٹتی رہی۔ غم وغصہ سے پاگل ٹہلتی رہی۔ صبح روز کے معمول کی طرح سلیمہ بیگم نماز سے فارغ ہوکر کچن کے سامنے لان پر پڑی کرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ اوپر سے شاہینہ نے انہیں دیکھا۔ نیچے اتر کر وہ کچن میں گئی۔ سلیمہ بیگم پڑھنے میں محو تھیں۔ اچانک ان کے سر پر ایک ہتھوڑا پڑا۔

وہ چیخ بھی نہ سکیں اور کرسی سے لڑھک گئیں۔ اتنے میں مالی جو وہاں سے گذر رہا تھا دیکھا کہ شاہینہ کے ہاتھ میں موصل ہے جیسے اس نے اپنی ساس کے سر پر دے مارا ہے۔ وہ یہ دیکھ کر سکتے کے عالم میں کھڑا ہوگیا۔ پھر بھاگ کر سلیمہ بیگم کے پاس آیا جن کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ نیچے زمین پر گر پڑی تھیں۔

اس نے شاہینہ کو دیکھا جو ایک زخمی ناگن کی طرح غصہ میں بھری دوسرا وار کرنے جا رہی تھی۔ مالی نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور چلانے لگا۔ بڑے سرکار جلدی آیئے۔ دیکھئے یہ کیا ہوگیا۔

گھر کے تمام لوگ جمع ہوگئے۔ ممی کو فوراً ہاسپٹل لے جایا گیا۔ لیکن وار اتنا کاری تھا کہ ان کے بچنے کے آثار کم تھے۔

شاہینہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ یہی تو تھا میری راہ کا کانٹا۔ میں نے اسے ہٹا دیا۔ مجھے منصور سے الگ کرنے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔

منصور گھبرایا ہوا آیا۔ ''یہ کیا کیا تم نے شاہینہ''۔

کیا میں تمہیں اسی لئے گھر لایا تھا۔ ماں نے تو اپنے خاندانی وقار کو میری ضد پر قربان کر دیا تھا۔ لیکن تم نے تو انہیں ہی قربان کر دیا۔

''بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا! وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔

پاس پڑوس' دوست احباب سب غمزدہ تھے۔ ماحول پر ماتم چھایا ہوا تھا۔

''دیکھ لیا نچلے طبقہ کی عورت سے شادی کا انجام''۔ بھائی کہنے لگے۔ اماں سچ ہی کہتی تھیں شادی اپنے برابر والوں میں کرنا چاہیے۔

افسوس! اب کیا کر سکتے ہیں؟

ادھر منصور صدمے اور رنج کے مارے دنیا و مافیہا سے بے خبر سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔

☆☆☆

ثریا جبین
گرین منشن۔ فلیٹ نمبر B-7'
'10-3-276/277,
ہمایوں نگر' حیدرآباد (تلنگانہ)
Mob: 9849130248

اُردو ہماری مادری زبان ہے۔ اس کی حفاظت کریں
خود بھی اُردو پڑھیں اور اپنے بچوں کو بھی اُردو پڑھائیں۔

www.urduacademyts.com

ساس کو زہر دینے کا طریقہ

آپ کی ساس سے نہیں بنتی تو زہر دے دو۔

طریقہ ہم بتاتے ہیں:

ایک لڑکی جس کا نام تبسم تھا اس کی شادی ہوئی وہ سسرال میں اپنے شوہر اور ساس کے ساتھ رہتی تھی۔ بہت کم وقت میں ہی تبسم کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ساس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

ان دونوں کی شخصیت بالکل مختلف تھی اور تبسم اپنی ساس کی بہت ساری عادتوں سے پریشان تھی۔ اس کی ساس ہر وقت تبسم پر طنز کرتی رہتی تھیں جو اسے بہت ناگوار گزرتا تھا۔ آہستہ آہستہ دن اور پھر ہفتے بیت گئے لیکن تبسم اور اس کی ساس کی تکرار ختم نہ ہوئی۔ ان تمام نااتفاقیوں نے گھر کا ماحول بہت خراب کر دیا تھا جس کی وجہ سے تبسم کا شوہر بہت پریشان رہتا تھا۔ آخر کار تبسم نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ساس کا برا رویہ اور برداشت نہیں کرے گی اور وہ اب ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔

تبسم اپنے پاپا کے ایک بہت اچھے دوست احمد انکل کے پاس گئی جو جڑی بوٹیاں بیچتے تھے۔ تبسم نے انھیں ساری کہانی بتائی اور ان سے کہا کہ وہ اس کو تھوڑا سا زہر دے دیں تاکہ ہمیشہ کے لئے یہ مسئلہ ختم ہو جائے۔

احمد انکل نے تھوڑی دیر کیلئے کچھ سوچا اور پھر کہا کہ تبسم میں اس مسئلے کو حل کرنے میں تمہاری مدد کروں گا۔ لیکن تمہیں ویسا ہی کرنا ہوگا جیسا میں تمہیں کہوں گا۔

تبسم راضی ہوگئی۔

احمد انکل ایک کمرے میں گئے اور تھوڑی دیر بعد اپنے ہاتھ میں کچھ جڑی بوٹیاں لے کر لوٹے۔ انھوں نے تبسم کو کہا کہ تم اپنی ساس کو مارنے کیلئے فوری زہر استعمال نہیں کرسکتیں کیونکہ اس طرح سب تم پر شک کریں گے۔ اس لئے میں تمہیں یہ جڑی بوٹیاں دے رہا ہوں‘ یہ آہستہ آہستہ ان کے جسم میں زہر پھیلائیں گی۔ ہر روز تم کچھ اچھا پکانا اور پھر انھیں کھانا دیتے وقت اس میں یہ جڑی بوٹیاں ڈال دینا۔

اور ہاں اگر تم چاہتی ہو کہ کوئی تم پر شک نہ کرے کہ تم نے انھیں مارا ہے تو تمہیں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ تمہارا رویہ ان کے ساتھ بہت دوستانہ ہو۔ ان سے لڑائی مت کرنا‘ ہر بات ماننا اور ان کے ساتھ ایک ملکہ کی طرح برتاؤ کرنا۔ تبسم یہ سب سن کر بہت خوش ہوئی‘ اس نے احمد انکل کا شکریہ ادا کیا اور جلدی سے گھر چلی گئی کیونکہ اب اسے اپنی ساس کو مارنے کا کام شروع کرنا تھا۔

ہفتے گزر گئے اور مہینے‘ تبسم روز کچھ اچھا پکا کر اپنی ساس کو خاص طور پر پیش کرتی تھی۔ اسے یاد تھا کہ احمد انکل نے اس سے کہا تھا کہ اسے اپنے غصے پر قابو رکھنا

افسانہ

www.urduacademyts.com

ہے۔ اپنی ساس کی خدمت کرنی ہے اور ان کے ساتھ اپنی ماں جیسا برتاؤ کرنا ہے۔ چھ مہینے گزر گئے' گھر کا نقشہ تقریباً بدل چکا تھا۔ تبسم نے کوشش کر کے اپنے غصے پر قابو کرنا سیکھ لیا تھا' اب اکثر وہ اپنی ساس کی باتوں پر ناراض اور غصہ نہ ہوتی۔

چھ ماہ میں ایک بار بھی اس کا اپنی ساس سے جھگڑا نہیں ہوا تھا اور اب اسے وہ بہت اچھی لگنے لگی تھیں اور ان کے ساتھ رہنا بھی آسان لگنے لگا تھا۔ اس کی ساس کا رویہ بھی اس کے ساتھ بہت بدل گیا تھا اور وہ بھی تبسم کو اپنی بیٹیوں کی طرح پیار کرنے لگیں تھیں۔ وہ اپنے سب دوستوں کے درمیان تبسم کی تعریفیں کرتی تھیں۔ تبسم اور اس کی ساس دونوں اب ایک دوسرے کو ماں بیٹی کی طرح سمجھنے لگی تھیں۔

تبسم کا شوہر بھی یہ سب دیکھ کر بہت خوش تھا۔ ایک دن تبسم پھر احمد انکل کے پاس آئی۔ تبسم نے کہا کہ آپ مجھے طریقہ بتائیں کہ کیسے میں اپنی ساس کو اس زہر سے بچاؤں جو میں نے انہیں دیا ہے؟ وہ بہت بدل گئیں ہیں۔ میں ان سے بہت پیار کرتی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ وہ اس زہر کی وجہ سے مر جائیں جو میں نے انھیں دیا ہے۔

احمد انکل مسکرائے اور کہنے لگے کہ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہیں زہر نہیں دیا تھا بلکہ جو جڑی بوٹیاں میں نے تمہیں دی تھیں وہ وٹامن کی تھیں تاکہ ان کی صحت بہتر ہو جائے۔

زہر صرف تمہارے دماغ میں اور تمہارے رویے میں تھا لیکن وہ سب تم نے اپنے پیار سے ختم کر دیا۔ یاد رکھیے' ہمارا رویہ' ہمارے الفاظ اور ہمارا لہجہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ دوسرے ہمارے ساتھ کیا رویہ اپناتے ہیں!!

اللہ پاک ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

''آمین یارب العالمین''

☆☆☆

افسانہ

حاتم طائی کے چار علم

حاتم طائی نے کہا تھا:

''میں نے چار علم اختیار کیے اور دنیا کے تمام عالموں سے چھٹکارا پالیا...

کسی نے پوچھا'' وہ چار علم کون کون سے ہیں؟ حاتم طائی نے جواب دیا:

☆ پہلا یہ کہ میں نے سمجھ لیا کہ جو رزق میری قسمت میں لکھا ہے وہ نہ تو زیادہ ہوسکتا ہے، نہ کم۔ اس لیے زیادہ کی طلب سے بے فکر ہوگیا۔

☆ دوسرا یہ کہ اللہ کا دیا ہوا جو حق مجھ پر ہے وہ میرے سوا کوئی دوسرا ادا نہیں کرسکتا' اس لیے میں اس کی ادائیگی میں مشغول ہوگیا۔

☆ تیسرا یہ کہ ایک چیز مجھے ڈھونڈ رہی ہے' وہ ہے میری موت۔ میں اس سے بھاگ تو سکتا نہیں، لہذا اس کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا۔

☆ چوتھا یہ کہ میرا اللہ مجھ سے باخبر رہتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے شرم رکھی اور برے کاموں سے ہاتھ اٹھالیا۔

یہ چار علم زندگی کے لیے اصول اور ایسی مشعلِ راہ ہیں کہ جس نے انہیں اپنالیا زندگی اس کے لیے اتنی آسان اور مطمئن ہو جائے گی کہ دنیا میں کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا۔

ماخوذ

www.urduacademyts.com

غزلیں

پروفیسر فاروق بخشی

زندگی کی دھوپ میں تپتا ہوا صحرا ہوں میں
اُس کی آنکھوں کے سمندر میں مگر رہتا ہوں میں

میری کیا پہچان صحراؤں میں جیسے گُم ندی
کھو گئے سارے مسافر جس کے وہ رستہ ہوں میں

لکھ رہی ہے دھوپ میرے جسم پر اپنی کتاب
سب پڑھیں گے شوق سے جس کو وہی قصہ ہوں میں

مشورہ یہ ہے ذرا تم اس نظریہ سے لکھو!
جس کو دل سچ جانتا ہے بس وہی لکھتا ہوں میں

دونوں جانب بندشیں ہیں اِک طرف کیسے بڑھوں
پربتوں کے بیچ میں بہتا ہوا دریا ہوں میں

بس بچھڑنے سے محبت ختم ہوتی ہے کہیں
آج تک میرا ہے وہ اور آج تک اس کا ہوں میں

اب یقیں کیسے کروں فاروقؔ میرا تھا کبھی
اجنبی کی طرح جس کے سامنے بیٹھا میں

oOo

شعبہ اردو
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

محمد نورالدین امیرؔ

جب زمین فطرت پر حرص پاؤں رکھتی ہے
دوستوں کے چہروں سے دشمنی جھلکتی ہے

لب پہ مسکراہٹ کا ہر گھڑی رکھو مرہم
کیا خبر کہ زخموں کی کب کلی چٹکتی ہے

کوئی آتا جاتا ہے میری سانس کی لئے پر
رات بھر کوئی آہٹ روح میں دھڑکتی ہے

دشت جاں کی سرحد پر میں نے اس کو چھوڑا تھا
جانے کن اندھیروں میں زندگی بھٹکتی ہے

خوب میں نے سینچا ہے خونِ دل سے شعروں کو
ورنہ کب لکیروں سے شاعری چھلکتی ہے

لفظ لفظ خوشبو ہے مانتا ہوں میں ہمدم
تازگی ہو لہجے میں، تو غزل مہکتی ہے

با کمال ہوتے ہیں اے امیرؔ وہ شاعر
جن کی گفتگو میں بھی شاعری جھلکتی ہے

oOo

مکان نمبر: 18-8-229/19، نزد جامع مسجد محبوبیہ،
ریاست نگر، حیدرآباد۔

www.urduacademyts.com

اقبال شانہ

نظم

عید مبارک

گلشن گلشن، عید مبارک
ساون ساون، عید مبارک
گھر گھر برسیں عید کی خوشیاں
آنگن آنگن، عید مبارک
آؤ یار گلے لگ جاؤ
تن من، تن من، عید مبارک
چوڑی، کنگن، پائل بولے
چھن چھن، چھن چھن، عید مبارک
پردیسی بالم گھر آئے
ساجن ساجن، عید مبارک
پھولوں کی مالا پہنا دے
مالن مالن، عید مبارک
عید گلے سے گلا ملتا ہے
گردن گردن، عید مبارک
ویلکم شیخ مبارک صاحب
اہلاً و سہلاً، عید مبارک
وہ شانہ پر دے میں بیٹھا
چلمن چلمن، عید مبارک

oOo

مکان نمبر: 1-1-1498،
بودھن، نظام آباد۔ T.S.

ٹپیکل جگتیالی

مزاحیہ غزل

ایک نیتا کا حسیں خواب سہانا نکلا
مر گیا جیسے ہی وہ گھر سے خزانہ نکلا

دھوپ چہرے پہ پڑی بہہ گیا میک اپ سارا
آپ کا چہرا تو برسوں کا پرانا نکلا

ہاتھ دے کر وہ سلیقے سے مجھے بھاگ گیا
جس کو ہولا میں سمجھتا تھا وہ شانہ نکلا

کان میں بالی گلے میں ہے دوپٹہ اس کے
نو جواں آج کا افسوس زنانہ نکالا

بیٹھنے کرسی نہ سونے کے لئے بستر ہے
میرا سسرال فقیروں کا ٹھکانا نکلا

جب سے شاعر بنا پھرتا ہوں ٹپیکل بن کر
میری قسمت میں ہر اک گاوں کا کھانا نکلا

oOo

گنج روڈ،
جگتیال۔ T.S. ،505327

www.urduacademyts.com

جناب کوپّولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات، اقلیتی بہبود، بہبودی معمرین ومعذورین حکومت تلنگانہ نے انیس الغرباء، کرسچن بھون، مکہ مسجد، اجمیر شریف میں قیام گاہ، درگاہ جہانگیر پیراں، مولاعلی، درگاہ پہاڑی شریف کے تعمیری، مرمت وتزئین کے کاموں کے سلسلہ میں محکمہ اقلیتی بہبود کے اعلیٰ عہدیداروں کا جائزہ اجلاس طلب کیا اور تمام تعمیر وتزئین کے کاموں کی جلد تکمیل کرنے کی ہدایت دی۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں جناب اے۔ کے۔ خان آئی پی ایس (ریٹائرڈ) عزت مآب مشیر اقلیتی بہبود، جناب محمد امتیاز اسحاق چیرمین تلنگانہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن، جناب احمد ندیم آئی اے ایس پرنسپال سکریٹری اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ، جناب شاہ نواز قاسم آئی پی ایس ڈائرکٹر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ محترمہ کانتی ویسلی مینیجنگ ڈائرکٹر تلنگانہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن ودیگر عہدیدار دیکھے جاسکتے ہیں

جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ کی جانب سے رمضان 2022 میں دی گئی افطار پارٹی کے انتظامات کا جناب محمد محمود علی عزت مآب وزیر داخلہ، محابس وفائر سرویسیز حکومت تلنگانہ نے جائزہ لیا۔ اس موقع پر جناب ٹی۔ سرینواس یادو عزت مآب وزیر برائے افزائش مویشیان، سمکیات، ڈائری ڈیولپمنٹ کارپوریشن اور سینماٹوگرافی حکومت تلنگانہ، جناب اے۔ کے۔ خان آئی پی ایس (ریٹائرڈ) عزت مآب مشیر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ، جناب احمد ندیم آئی اے ایس پرنسپال سکریٹری اقلیتی بہبود، جناب شاہ نواز قاسم آئی پی ایس ڈائرکٹر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ ودیگر عہدیدار دیکھے جاسکتے ہیں

Urdu Monthly

Qaumi Zaban

AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY

Vol. 07 No. 05 May, 2022

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622

Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022

Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ 29 اپریل 2022ء کو فتح میدان اسٹیڈیم میں اُن کی جانب سے دی گئی افطار پارٹی میں شریک معززین وعوام سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں معزز وزراء، معزز ارکان پارلیمنٹ، معزز مہمانان وعوام دیکھے جاسکتے ہیں۔

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone : 040-23237810, Fax : 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com